اے بی سی ڈی

بشیشر پردیپ

PENGUIN BOOKS

ABCD

ڈاکٹر بشیشر پردیپ (اصل نام بشیشر لعل دھون) کی پیدائش 1925 میں چنیوٹ پاکستان میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد سے لکھنؤ میں رہائش پذیر ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے 1968 میں کیمسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ پیشہ سے سائنسداں بشیشر پردیپ 1951 سے افسانہ نگاری کررہے ہیں اور آپ کے کم وبیش ڈھائی سو افسانے ہندوپاک کے ادبی جریدوں میں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہوچکے ہیں۔1958 میں آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پیاس'' شائع ہوا اور تب سے اب تک آپ کی اردو وہندی کی کم وبیش 15 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔آپ کی متعدد کہانیاں انگریزی، ہندی، بنگالی، آسامی، تیلگو، کنڑ، پنجابی اور عربی میں بھی شائع ہوچکی ہیں۔آل انڈیا ریڈیو سے چھ درجن سے زائد کہانیاں نشر کی ہیں۔آپ کی تخلیقات کو کئی انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

اے بی سی ڈی

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

YATRA BOOKS PENGUIN BOOKS

YATRA BOOKS
203, Ashadeep, 9 Hailey Road, New Delhi-110001

پینگوئن بکس
پبلیشر ۔ پینگوئن گروپ

PENGUIN BOOKS
Published by the Penguin Group
Penguin Books India Pvt. Ltd, 11, Community Centre, Panchsheel Park, New Delhi 110017, India
Penguin Group (USA) Inc., 375 Hudson Street, New York, NY 10014, USA
Penguin Group (Canada), 90 Eglinton Avenue East, Suite 700, Toronto, Ontario, M4P 2Y3, Canada (a division of Pearson Penguin Canada Inc.)
Penguin Books Ltd, 80 Strand, London WC2R 0RL, England
Penguin Ireland, 25 St Stephen's Green, Dublin 2, Ireland (a division of Penguin Books Ltd)
Penguin Group (Australia), 250 Camberwell Road, Camberwell, Victoria 3124, Australia (a division of Pearson Australia Group Pty Ltd)
Penguin Group (NZ), 67 Apollo Drive, Rosedale, North Shore 0632, New Zealand (a division of Pearson New Zealand Ltd)
Penguin Group (South Africa) (Pty) Ltd, 24 Sturdee Avenue, Rosebank, Johannesburg 2196, South Africa

Penguin Books Ltd, Registered Offices: 80 Strand, London WC2R 0RL, England

First published in Urdu by Penguin Books India, Yatra Books 2008

10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

Typeset by K. A. Nomani
Printed at Chaman Offset Printers, New Delhi

فہرست

درد نہ جانے کوئی

کرکٹ میچ دیکھنے کا تو ایک بہانہ تھا۔ اسے چاہ تھی پاکستان جانے کی۔ پاکستان جہاں سے اُس کا خاندان ستاون برس پہلے ملک کی تقسیم کے بعد ''اس طرف'' آ گیا تھا۔ اس طرف جواب ہندوستان یا بھارت ہے۔

اسے چاہ تھی لاہور دیکھنے کی جہاں سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ اسے چاہ تھی کراچی دیکھنے کی جہاں وہ صرف ایک بار آٹھویں جماعت کے دنوں میں سیر کے لیے گیا تھا۔ اسے چاہ تھی لائل پور دیکھنے کی، جس کا نام اب فیصل آباد ہے۔ جہاں اس نے بچپن اور لڑکپن کے بہت سے برس گزارے تھے لیکن سب سے زیادہ چاہ تھی اسے چنیوٹ دیکھنے کی، جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ دریائے چنیوٹ جو چناب کے کنارے آباد ہے جس دریا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں پانی نہیں، محبت کرنے والے دلوں کا خون بہتا ہے۔ جو سوہنی مہیوال جیسی رومانی داستانوں کے لیے مشہور ہے۔ جس کے بارے میں وہاں کے نوجوان یہ گیت گنگنایا کرتے ہیں۔

بلّے بلّے وے چناں دیا پانیاں

تیرے کنڈیاں نے عاشقاں نے موجاں مانیاں

(اے دریائے چناب کے پانی! تیرا کیا کہنا! تیرے کناروں پر محبت کرنے والوں

نے موج مستی کے دن گزارے)۔

اگست 1947ء میں آخری بار اس نے اپنا وہ شہر دیکھا تھا۔اس کے بعد وہ آج تک وہاں نہ جاسکا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا لیکن ہر بار ایک عجیب قسم کے خوف نے اسے اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کردیا۔اسے ڈر تھا کہ وہ یادیں جو اس کے سینے کے اندر گہری، بہت گہری دبی پڑی ہیں، اچانک اُبھر نہ آئیں اور اسے تڑپانے نہ لگیں۔ وہ وہاں سے لوٹے گا کیسے؟ اس کے کچھ دوست اور رشتہ دار جو پاکستان گئے تھے، اپنے شہر کو اپنے مکان کو دیکھنے—— تو وہاں سے لوٹتے وقت آنکھوں میں آنسو اور دل میں درد لے کر آئے تھے۔ اپنی مٹی سے جدا ہو جانے کا درد!

ستاون برس پہلے جب وہ اپنی مٹی سے بچھڑے تھے تو دکھ اس وقت بھی تھا لیکن اس وقت اس دکھ پر، جان بچا کر صحیح سلامت ہندوستان پہنچنے کی فکر غالب تھی۔

جب گھر سے نکلے تھے تو اس خیال سے نکلے تھے کہ چند روز کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ بھلے ہی پاکستان میں رہیں گے۔لیکن رہیں گے تو اپنے گھر میں، اپنے شہر میں۔لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے ان پر واضح ہو گیا تھا کہ ان کا گھر ان کا شہر ان سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا تھا۔اور پھر انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان سے بھی بہت سے لوگ پاکستان آرہے ہیں۔یعنی سیاست کی سطح پر یہ آبادیوں کا تبادلہ تھا! ان ''ریفیوجیوں'' کو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے والوں کے مکانات اور زمینیں الاٹ ہوئیں اور ان کی چھوڑی ہوئی زمینیں اور مکانات ہندوستان سے پاکستان جانے والے ''مہاجروں'' کو الاٹ ہوئے نہ جانے ان کے مکان کا اب کون مالک ہے؟؟

اس کے والدین آگرہ میں بس گئے اور پھر وہیں اس کی اور اس کے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوئیں۔شروع شروع میں انھیں اپنا شہر، اپنا محلّہ، اپنا گھر، بہت یاد آتا لیکن پھر ان یادوں کا وقفہ لمبا ہوتا چلا گیا۔اور جب اس کے والدین کی نسل ختم ہوگئی تو یہ یادیں

اور بھی کم ہوگئیں۔ اس کے اپنے بچوں کے سامنے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، ان یادوں کو دہرانے کا مطلب محض انھیں ''ایڈونیچر اسٹوریز'' سنانا ہوگیا۔

ان ستاون برسوں میں نہ صرف اس کے والدین کی نسل ختم ہوئی۔ اس کی اپنی نسل کے بھی کئی افراد چل بسے اور اب تو اس کے پوتے پوتیاں، دوہتے دوہتیاں بھی شادی کے لائق ہوگئے تھے۔

اچانک ایک روز دہلی سے اس کی بیٹی کا فون آیا۔

''پاپا! آپ اور ممی پاکستان جانے کا پروگرام بنایئے۔ ہم لوگ بھی چلے چلیں گے۔ کرکٹ کا میچ بھی دیکھیں گے۔ لاہور بھی دیکھیں گے۔ اور آپ کا شہر چنیوٹ بھی دیکھ آئیں گے۔ ہزاروں لوگ پاکستان جارہے ہیں۔ بڑی آسانی سے ویزا مل رہا ہے''۔

''نہیں بیٹی۔ چنیوٹ جائیں گے تو وہاں سے اُداسی لیے لوٹیں گے۔ ایک ڈیپریشن۔ کیا فائدہ؟''

''ارے پاپا۔ ہم جو ہوں گے آپ کے ساتھ۔ ہم آپ کو بغیر اداسی کے صحیح سلامت لے آئیں گے —— چلیئے، بھائی اور بھابھی کو بھی تیار کرتے ہیں''۔

لیکن نہ تو اس کی بیٹی اور داماد جاسکے نہ ہی اس کا بیٹا اور بہو —— اور اس نے اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان جانے کا پروگرام بنا ہی لیا۔

اور اب وہ دونوں میاں بیوی لاہور جارہے تھے!

اس کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے لاہور کا میچ دیکھیں گے اور لاہور دیکھیں گے۔ اور اس کے بعد اپنے شہر جائیں گے۔ اس کی بیوی نے لاہور دیکھا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس نے تو پاکستان کا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ لوگ کاروبار کی وجہ سے تقسیم سے بہت پہلے آگرہ میں آبسے تھے۔ لیکن اس کی بیوی نے یہ ضرور سن رکھا تھا کہ جس نے لاہور نہیں ویکھیا او جمیا ہی نہیں'' (جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا) اور یہ اس نے پاکستان

بننے سے پہلے سن رکھا تھا اور اب اس کا خیال تھا کہ لاہور دیکھ لیا اوراپنے شوہر کا شہر چنیوٹ دیکھ لیا تو سمجھو پاکستان دیکھ لیا!ــــ اس کے شوہر کا شہر، اس کا محلّہ، اس کی گلی، اس کا مکان۔اور کیا دیکھنا ہے اس نے پاکستان میں؟

وہ لوگ لاہور پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے باسیوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انھیں میچ دیکھنے میں اتنا مزہ نہیں آیا، جتنی خوشی انھیں وہاں کے باشندوں کا اپنے تئیں سلوک دیکھ کر ہوئی۔ انھیں لگا جیسے وہ سچ مچ اپنے بچھڑے ہوئے بہن بھائیوں سے مل رہے ہوں۔ رکشاوالا ہے تو اس نے بھاڑے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ریسٹورنٹ والا ہے تو اس نے چائے یا ناشتہ کے پیسے لینے سے منع کر دیا۔ ہوٹل والا ہے تو اس نے نہایت مناسب کرایہ پر کمرہ دیدیا۔ کئی لوگوں نے تو انھیں مہمان بنا کر اپنے گھر میں رکھنے کی پیش کش بھی کر دی۔ اور کچھ لوگ تو وہاں دو تین دن کے لیے کسی نہ کسی کے مہمان بن کر رہے بھی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں ہوئے جذبات سے مغلوب بھی ہوگئے۔ یہ کرکٹ کا میچ تھا کہ دلوں کی ہار جیت تھی؟

لاہور میں اس نے اپنی بیوی کو خوب سیر کرائی۔ کئی بازاروں میں کئی جگہوں پر لے گیا۔ وہ کالج بھی دکھایا جہاں سے اس نے گریجویشن کیا تھا اوراب وہ ایئر کنڈیشنڈ بس میں چنیوٹ جا رہے تھے۔

یہ تین گھنٹے کا بس کا سفر اس نے یادوں میں گزرا۔ چنیوٹ پہنچنے سے پہلے ہی وہ چنیوٹ پہنچ گیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ چنیوٹ اب پسماندہ علاقہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ سڑکیں پکی بن گئی ہیں۔شہر میں فیکٹریاں، ڈگری کالج، سرکاری اور غیر سرکاری ہسپتال، بڑی بڑی دکانیں شوروم اور ریسٹورنٹ کھل گئے ہیں۔

پھر اچانک اسے یاد آنے لگا اپنا پرانا شہر، وہ چنیوٹ جو اس نے ستاون برس پہلے چھوڑا تھا اسے یاد آئی اپنا گلی جہاں اس نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن گزارا تھا۔ یہ گلی گیارہ

بارہ فٹ چوڑی تھی۔ ان کے مکان کے اگلے حصہ کے کمروں کی کھڑکیاں اس گلی میں کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر گلی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جب وہ چار برس کا تھا تو اس کی ماں تیئس چوبیس برس کی تھیں۔ لڑکی ہی تو لگتی تھی۔ چاندنی رات تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی ماں گلی میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیکلی کھیل رہی تھی۔ جس کھیل میں ماں اور اس کی ایک سہیلی ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پکڑے، سر اور پیٹھ کو پیچھے کی طرف جھکائے چکر پہ چکر لگا رہی تھیں۔ ماں کی لمبی چوٹی اس کی پیٹھ کے پیچھے عموداً لہرا رہی تھی۔

کیکلی کلیر دی ـــــ پگ میرے ویر دی دوپٹہ بھرجائی دا۔ پھٹے منہ جوائی دا

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوسرا گیت گا رہی تھیں۔ سب سہیلیاں مل کر اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں پر باری باری تالیاں بجاتے ہوئے۔

چناں وے تیری میری چاندنی تاریا وے تیری میری لو

چن پکائیاں روٹیاں۔ تارا کرے رسو

چن دیاں پکیاں کھالیاں تارے دیاں رہ گیاں دو

(اے چاند! یہ چاندنی تیری اور میری دونوں کی ہے۔ اے ستارے! یہ لو تیری اور میری سانجھی ہے۔ چاند نے روٹیاں پکائیں اور تارے نے رسوئی سجائی۔ چاند کی پکائی ہوئی کھالی گئیں۔ لیکن تارے کی دو رہ گئیں۔)

ان کی گلی بائیں جانب کچھ دور جا کر ایک کھلے میدان میں ختم ہو جاتی تھی اور اس کھلے میدان میں ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا۔ جس کے چاروں طرف ایک بہت بڑا چبوترہ بنا ہوا تھا، جو گرمیوں کے دنوں میں اس گلی کے باشندوں کی آرام گاہ تھا۔ اسٹیشن آنے جانے کے لیے ایک کچا راستہ اسی کھلے میدان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ لاہور سے چنیوٹ تک تین گھنٹے بس کے سفر کے دوران، اس کی عمر کے بائیں برسوں تک کی پاکستان اور خاص طور پر چنیوٹ میں گزاری زندگی کی جھانکیاں اس کی نظروں کے سامنے

سے گزرتی رہیں۔ کبھی ترتیب وار، کبھی بلاترتیب ___ اور پھر ان کی بس چنیوٹ کے بس اڈے پر پہنچ گئی۔ دل کی دھڑکن یکبارگی تیز ہوگئی۔ چند سیکنڈ لگ گئے اسے سنبھلنے میں۔ کتنا وسیع ہوگیا تھا یہ بس اڈہ! کتنی بسیں کھڑی تھیں! اس نے پاس کھڑا ایک رکشہ لیا اور اسے اپنے محلے کا نام بتا کر اس میں بیٹھ گیا۔ ان ستاون برسوں میں اسٹیشن سے ان کے محلے تک کے راستے میں اتنی عمارتیں بن گئی تھیں کہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا رکشہ اسے صحیح راستے سے لے جارہا تھا یا غلط راستے سے؟ جو کھیت تھے، جن کے بیچوں بیچ اسٹیشن سے اس کے محلے تک کچا راستہ جاتا تھا وہ سب عمارتوں سے اٹے پڑے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ رکشہ اسی راستے پر جارہا تھا جو پہلے کچا تھا اور اب پکی سڑک بن گیا تھا اور اب اس کی گلی آنے ہی والی تھی ___ لیکن یہ کیا؟ وہ کھلا میدان ___ وہ برگد کا پیڑ ___ وہ کہاں گئے؟ اس نے رکشہ رُکوا کر پاس سے گزرتے ہوا اپنی ہی عمر کے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

''ارے بھائی صاحب! اس جگہ ایک کھلا میدان تھا جس میں ایک برگد کا پیڑ تھا۔ وہ؟؟ وہ؟؟''

بوڑھے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''یہ جو شاپنگ کمپلیکس دیکھ رہے ہیں نا آپ۔ اسی جگہ تھا وہ میدان۔ اور برگد کا پیڑ۔ اب تو بیں برس ہوگئے اس کمپلیکس کو بنے ہوئے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''میں آگرہ سے آیا ہوں ___ میں ہندوستانی ہوں۔ ویسے میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ اسی محلے کا''۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔

''عجیب بات ہے! ہم لوگ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے آئے تھے۔ میری فیملی اور ہمارے بہت سے عزیز رشتہ دار''۔

''میں تو اپنا مکان، اپنی گلی دیکھنے آیا ہوں۔ یہ سامنے والی گلی تھی ہماری۔ یہ گلی 'کپوراں والی' ہے نا؟''

اس نے اپنی گلی کے دہانے کو پہچاننے کی کوشش کی۔
''جی—— یہ تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس گلی کا کیا نام تھا؟ جب ہم آئے تھے اس کا نام ''آزاد اسٹریٹ'' پڑ چکا تھا۔ اس گلی کے بہت سے مہاجر آگرہ سے آئے تھے۔ میں بھی اسی گلی میں رہتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ''۔
اس نے رکشہ چھوڑ دیا۔ اور اب وہ دونوں میاں بیوی اس شخص کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئے۔ اس نے دیکھا، گلی کے سرے پر اب بھی ارائیں قوم کی عورتیں ساگ سبزی بیچ رہی تھیں!
اس نے گلی میں گھستے ہی کئی مکان پہچان لیے۔ کئی مکان باہر سے دوبارہ نئے سرے سے بن کر تیار ہو چکے تھے۔ وہ نہیں پہچان پا رہا تھا۔ اس کا اپنا مکان گلی کے عین وسط میں دائیں طرف تھا۔ اب وہ رک رک کر چل رہا تھا۔ اس کی بیوی بڑی دلچسپی سے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور وہ بوڑھا انھیں اس گلی میں لاکر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ دو بچھڑے ہوؤں کو ملانے جا رہا ہو! اور اب وہ گلی کے وسط میں پہنچ گئے۔ اور وہ ٹھٹھک گیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہاں تو ایک عالیشان مکان کھڑا تھا۔ اس عالیشان مکان میں وہ اپنا مکان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاں، اسی جگہ تو تھا اس کا مکان؟ اس کے آس پاس کے مکان بھی کچھ زیادہ ری ماڈل، ہو کر مشکل سے پہچان میں آ رہے تھے۔ یہ کیسر چند کا مکان تھا اور اس کے ساتھ والا روشن لعل کا مکان تھا۔ یہ سب مشکل سے پہچان میں آ رہے تھے۔ لیکن ان کے مکان کے سامنے والا اس کے خالو کا مکان اسی طرح کھڑا تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا۔ اپنے خالو کے مکان سے اس نے اپنے مکان کے محل وقوع کا اندازہ لگا لیا۔
''کیا اسی جگہ تھا آپ کا مکان؟'' اس کی بیوی کی آواز نے اسے چونکا دیا ''آپ کو یاد ہے نا؟ اسی جگہ تھا آپ کا مکان؟''

''ہاں بھئی — یہ اس کے سامنے والا مکان میرے خالو کا تھا۔ یہ مکان اسی طرح کھڑا ہے۔ اسے میں اچھی طرح سے پہچان رہا ہوں۔ اسی کے سامنے تھا ہمارا مکان — ہم دونوں کے مکانوں کی اوپر کی چھتوں پر بنے کٹہرے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اوپر سے ہم لوگ ایک دوسرے کو کوئی لمبی چیز آسانی سے پکڑا دیتے تھے''۔

اس کی آواز روہانسی ہوگئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ مجید صاحب کا مکان ہے۔ انھوں نے اپنے پڑوس والا مکان بھی خرید لیا تھا۔ اور دونوں کو گرا کر یہ نیا مکان بنوالیا۔ یہی کوئی پندرہ برس پہلے''۔ بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اب وہ اس عالیشان مکان کے سامنے، اپنے خالو کے مکان کے دروازے پر کھڑا کبھی خالو کے مکان کو اور کبھی اس عالیشان مکان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اس کی بیوی بھی پریشان ہو اٹھی۔ اور وہ بوڑھا کبھی اسے دیکھتا، کبھی اس کی بیوی کو — اور کبھی اس مکان کو۔

''تو —؟'' اسے اچانک اس بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

''شکریہ بھائی صاحب۔ اب ہم چلتے ہیں''۔ اس نے بوڑھے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ہاتھ ملا کر جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ آہستہ آہستہ گلی کے باہر جا رہا تھا تو اچانک اسے خیال آیا کہ آگرہ میں کسی مہاجر کا جو مکان اسے ملا تھا۔ اس نے بھی تو اس مکان کو گرا کر اب نیا مکان بنوالیا ہے!

ماں

اُسے اپنی ماں کی تلاش تھی ــــــ ماں، جس نے اسے جنم دیا تھا۔ لیکن جو اسے ڈیڑھ برس کی عمر میں دیوریا کے ایک اسپتال کے رحم وکرم پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے علاج کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ بہت غریب تھی۔ غریب اور نادار بیوہ۔

رتن سوزوکی جاپان سے ہندوستان اپنے جاپانی ماں باپ مسٹر ٹورو سوزوکی اور مسز ایکوسوزوکی کے ساتھ اپنی جنم دینے والی ہندوستانی ماں سرلا دیوی کی تلاش میں آیا تھا۔ مسٹر اور مسز سوزوکی اٹھارہ برس قبل جب پہلی بار ہندوستان آئے تو اس وقت وہ مہاتما بدھ سے متعلق تین جگہوں ــــــ سارناتھ، بودھ گیا اور کُشی نگر کی زیارت کرنے آئے تھے۔ وہ ان علاقوں کے اسپتالوں میں بھی گئے ــــــ دوائیاں اور کئی قسم کے سرجیکل اوزار اسپتالوں میں دان دینے کے لیے۔ وہ جاپان کے شہر 'اوساکا' کے رہنے والے تھے اور وہاں کی ایک بہت بڑی میڈیسن اینڈ سرجیکل کمپنی کے مالک تھے۔ جب وہ کشی نگر گئے تو کشی نگر کے پاس کے علاقے دیوریا کے ایک اسپتال بھی گئے۔ وہاں انھوں نے اس لاوارث بیمار بچے رتن کو دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا۔ اس وقت تک اسپتال والے پولیس کی مدد سے اس بچے کی ماں کو تلاش کروانے کی تمام کارروائی کر چکے تھے اور اب وہ بچہ ایک مقامی یتیم خانے کی تحویل میں تھا۔ اور اس اسپتال میں یتیم خانے کے مکین کے طور پر اس کا علاج ہو رہا تھا

انھوں نے یتیم خانے سے رجوع کیا اور اسے اپنے بیٹے کے روپ میں اپنے ساتھ جاپان لے گئے۔ حالانکہ ان کی اپنی اولاد بھی تھی۔ ایک بیٹا۔ ایک بیٹی۔ لیکن اس لاوارث بچّے کو اپنا بیٹا بنا کر انھیں ایک انوکھی مسّرت کا احساس ہوا اور انھوں نے اس کے رتن نام کے ساتھ سوزوکی جوڑ کر اسے ''رتن سوزوکی'' نام دے دیا۔

رتن سوزوکی کو شروع شروع میں اپنے میں اور اپنے جاپانی بھائی بہن اور دوستوں میں کچھ فرق نظر نہ آیا۔ لیکن جب اس کا شعور کچھ پختہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ، اس کے نقوش دوسرے لڑکے لڑکیوں سے مختلف تھے۔ ایک دم مختلف! لیکن اپنے اس احساس کے بارے میں اس نے نہ تو گھر میں کسی سے استفسار کیا اور نہ ہی کبھی اپنے جاپانی دوستوں سے بات کی۔ میڈیکل کالج میں اپنی ہم جماعت لڑکی یومیکو سُودانشا سے بھی نہیں۔ یومیکو بچپن سے اس کی ہم جماعت تھی۔ اور اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔ بچپن اور لڑکپن کی یہ پسند آگے چل کر محبّت میں بدل گئی۔ رتن کو اس کا ملگجا گورا رنگ، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، اس کی تھوڑی سی چپٹی ناک اور چوڑا دہانہ اچھا لگتا۔ اور یومیکو کو اس کا سانولا رنگ اور تیکھے نقوش۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ محبت کچھ اندرونی معاملہ ہے۔ روح کی گہرائیوں تک اثر انداز ہونے والا۔ اور خارجی شکل وصورت کو زیادہ اہمیت نہ دینے والا۔

کالج میں یومیکو سوداانشاء کی محبت، کالج سے باہر جاپانی دوستوں کی دوستی اور گھر میں اپنے جاپانی ماں باپ اور بھائی بہن کی شفقت۔ ان سب کے باوجود اسے یہ خیال بار بار ستاتا کہ وہ ان سب سے مختلف ہے!

''تو پھر وہ کون ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں کہاں سے آ گیا — ؟!'' اور اسے اپنی زندگی میں ایک عجیب خلا سا محسوس ہونے لگا — خلا! بے چینی!! اُلجھن۔!!

اور ایک دن اس کے جاپانی ماں باپ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

''دیکھو بیٹا! بے شک تمہیں ہندوستانی والدین نے جنم دیا ہے لیکن بیٹے کی طرح پالا تو ہم نے ہے نا—— اس لیے تم اب ہمارے بیٹے ہو۔ ہماری کمپنی، ہمارے کاروبار، ہماری جائداد میں اپنے بڑے بھائی کے برابر کے حصہ دار''۔

اپنے جاپانی والدین کی طرف سے حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد اس کے من کی الجھن تو دور ہوگئی—— لیکن اس کے دل میں اپنی ماں سے ملنے کی خواہش اُبھر آئی—— ماں! جس نے جنم دیا تھا—— اس سے ملنے کی اور اس کے گلے لگ جانے کی خواہش!

اچانک اس کے تصور کی آنکھوں نے دیکھا—— ایک مجبور، بے بس غریب بیوہ اپنے بیمار بچے کو سینے سے لگائے اسے اسپتال میں داخل کرانے آئی ہے—— بچہ بے ہوش ہے۔ وہ کچھ دیر اس کے بیڈ کے پاس بیٹھتی ہے، اور پھر جیسے ہی بچے کے پاس اکیلی رہ جاتی ہے، اس کا ماتھا چومتی ہے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور پھر جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

اسے اپنے ماں باپ سے زیادہ اصرار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ دونوں خود ہی تیار ہو گئے ہندوستان آنے کے لیے اپنے ہندوستانی بیٹے کی خاطر—— اس کی جنم داتا کو تلاش کرنے کے لیے—— اور اب وہ تینوں دیوریا کے اس یتیم خانے میں تھے جہاں سے اٹھارہ برس قبل وہ رتن کو لے گئے تھے۔ یتیم خانے کے منیجر نے وہ تمام کاغذات نکال لیے جو رتن کی ماں سے متعلق تھے۔ پولیس میں درج کروائی گئی ایف۔ آئی۔ آر کی نقل اور اخباروں میں دیئے گئے اشتہارات سب۔ ہر اشتہار میں رتن کی تصویر موجود تھی اور اس کی ماں سرلا دیوی سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ آ کر بچے کو لے جائے۔ لیکن اس اپیل کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا۔

''منیجر صاحب! ہوسکتا ہے کوئی بھی اشتہار ماں کی نظر سے نہ گزرا ہو—— ماں پڑھی لکھی تو تھی نہیں —— اور پھر اس وقت تو وہ اپنے گاؤں سے بھی کہیں دور چلی گئی ہوگی!''

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ—— کشی نگر کے پاس اس کے گاؤں بری پور میں پولیس اسے تلاش کرنے گئی تھی۔ اس کا پتہ صحیح تھا—— لیکن ماں وہاں نہیں ملی—— یہ دیکھئے —— فائل میں پولیس کی فائنل رپورٹ میں لکھا ہے:—— ''چھ ماہ کی مسلسل تلاش کے بعد بھی بچّے کی ماں نہیں مل سکی''۔

رتن سوزوکی کو اپنے گاؤں سے پتہ چلا کہ اس کی ماں کافی عرصے کے بعد ایک بار اپنے گھر واپس آئی تھی۔ لیکن گاؤں والوں کے طعنے سننے کے بعد وہ وہاں نہ رہ سکی اور اس نے اپنا مکان بیچ دیا۔

''لیکن وہ دور کہیں نہیں گئی—— وہ دیوریا میں ہی ہے۔ وہاں پر دو تین بار دیکھی گئی ہے۔ شاید کسی کے گھر میں کام کرتی ہے!'' اسے ایک پڑوسی نے بتایا۔

اس نے اپنے جاپانی ماں باپ سے صاف طور پر کہہ دیا:

''ممی! —— پاپا! یہ بات تو آپ لوگ اچھی طرح سے جان لیں کہ اس وقت میرے لیے اگر کوئی بات اہم ہے تو وہ ہے اپنی جنم دینے والی ماں کی تلاش—— ماں سے ملنا''۔

''ٹھیک ہے بیٹا—— ہم تمہارے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ تمہاری ماں مل جائے گی تو ہمیں خوشی ہوگی—— اور ہمیں یقین ہے کہ تمہاری ماں مل جائے گی۔ ضرور ملے گی''۔

اپنے گاؤں جا کر وہاں کے لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد اس نے اپنی ماں کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک نقشہ سا بنالیا تھا۔ لمبے کالے بال۔ لمبا قد۔ گہرا سانولا رنگ—— رنگین سادہ ساری بدن پر اور ہوائی چپل پاؤں میں۔

وہ کئی بار اپنے گاؤں جا چکا تھا۔ ڈیڑھ دوسو گھروں پر مشتمل اس کا یہ ہندوستانی گاؤں اس کے جاپانی شہر ''اوساکا'' کے مقابلے میں نہایت معمولی سا تھا۔ لیکن اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کا دل چاہتا وہ اپنے گھر کے سامنے لگے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا اپنے گھر کو تکتا رہے۔ معمولی سا اس کا گاؤں۔ معمولی سا اس کا گھر۔ صرف ایک کوٹھری اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل! اس کے موجودہ مالک کی مرضی سے اس نے اپنی وہ کوٹھری دیکھ لی تھی۔ اس کوٹھری میں اس کا جنم ہوا تھا، گاؤں کی ایک دائی کے ہاتھوں۔ دو ماہ کا تھا تو اس کا باپ ایک حادثے کا شکار ہو گیا قدرت کا یہ کیسا کھیل تھا کہ ڈیڑھ برس کی عمر تک اس کوٹھری میں ایک بیوہ ماں کی گود میں کھیلا۔ چھ ماہ اسپتال میں رہا اور پھر ایک دم اتنی دور جا بسا۔ ایک بہت بڑے شہر میں۔ امیر والدین کے یہاں!

اس نے ماں کو تلاش کرنے کے لیے دیوریا کے اخباروں میں اشتہار چھپوائے جن میں اس کی ڈیڑھ برس کی تصویر اور موجودہ تصویر دونوں چھپی تھیں۔ اور ساتھ میں چھپا تھا:

''ماں کی تلاش ——

ایک ہندوستانی لڑکا رتن، جو اس وقت جاپان کا باشندہ ہے۔ اپنی جنم دینے والی ماں سرلا دیوی کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ لوگوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس تلاش میں اس کی مدد کریں۔ اگر کسی کو اس کی ماں سرلا دیوی کے بارے میں معلوم ہو یا پتہ چلے تو وہ کشی نگر کے گیسٹ ہاؤس میں اطلاع کر دے۔ اپنی ماں سے ملنے کے لیے وہ بہت بے چین ہے''——

اور اب کئی دن ہو گئے تھے اشتہار چھپے ہوئے۔

وہ جب سے کشی نگر آیا تھا تقریباً ہر روز کسی نہ کسی طرف گھومنے نکل جاتا کبھی کسی مندر کی طرف کبھی مہاتما بدھ کے نروان استھل کے کھنڈرات کی طرف اور کبھی کسی پارک میں۔ اور ماں کے بارے میں سوچا کرتا۔

''اتنی بھی کیا مجبوری تھی ماں! کہ تو مجھے اسپتال میں چھوڑ کر گئی تو پھر خبر ہی ہیں لی میری ــــ؟ اب تو آجا دیکھ! میں تیرے لیے کتنا اُداس ہوں''!

اور پھر جیسے ماں تک اس کی آواز پہنچ گئی ــــ ایک مندر میں اسے ماں مل گئی ــــ اور یہ الگ ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔

اس روز جب وہ گھر سے نکلا تو اس کے قدم آپ ہی آپ اس مندر کی طرف اٹھ گئے جہاں مہاتما بدھ کی ایک لمبی مورتی نیم دراز سے انداز میں نصب ہے، جو ایک زاویے سے مسکراتی نظر آتی ہے اور دوسرے زاویے سے سوچوں میں ڈوبی ہوئی۔ زندگی کے دو خاص پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہوئی ــــ مندر کی سیڑھی پر اس نے ادھیڑ عمر کی ایک عورت کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے پاس سے گزرا تو وہ عورت اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے قدم رُکنے سے لگے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ جب وہ مہاتما بدھ کے قدموں میں پھول رکھ رہا تھا تو اس نے دیکھا، وہ عورت اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ باہر نکلا تو وہ عورت وہیں کھڑی رہی ــــ وہ سیڑھیوں کے پاس آیا تو اس نے سیڑھیوں پر رکھے اس کے جھولے میں سے جھانکتا اپنا اشتہار دیکھ لیا۔ اشتہار میں چھپی اس کی تصویر صاف نظر آ رہی تھی ــــ وہ وہیں رک گیا۔ جب وہ عورت اپنے سامان کے پاس آئی تو اس نے بے دھڑک اس سے پوچھ لیا۔

'''' آپ ــــ؟ آپ سرلا دیوی ہیں نا ــــ؟''

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سہمی ہوئی ممتا!

''ماں ــــ!''

''مسکو!'' (Musco)۔ اس عورت نے اسے جاپانی زبان میں بیٹا کہہ کر پکارا۔ اور یہ سن کر اس کے لبوں سے آپ ہی آپ جاپانی زبان میں ''ماں'' کا لفظ ''اوکاساں'' نکلا۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ دونوں کی سسکیاں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہی

تھیں۔ اور آنسو چہروں کو تر کر رہے تھے۔

''چلو ماں ـــــ'' وہ اسے گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور وہ چپ چاپ اس کے ساتھ کھنچتی سی چلی آئی۔

''تو اب تیار ہو جا ماں ـــــ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا''۔

''تمہارے ساتھ ـــــ ؟ اتنی دور ـــــ ؟! نہ بابا ـــــ میں اپنا دیس چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔ تجھے دیکھ لیا۔ تجھ سے مل لی ـــــ تو وہاں خوش ہے، یہ کافی ہے میرے لیے ـــــ تیری حالت اتنی خراب تھی کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا ـــــ اور تمہارے علاج کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ تو میں تمہیں اسپتال میں چھوڑ آئی ـــــ اس لیے کہ وہ لوگ شاید تمہارا علاج ٹھیک سے کر دیں ـــــ تمہیں اسپتال میں چھوڑ دینے کے بعد میں باہر چلی گئی ـــــ گورکھپور ـــــ جب وہاں سے واپس آئی تو یتیم خانے سے پتہ چلا کہ تجھے کوئی جاپانی جوڑا اپنا بیٹا بنا کر لے گیا ہے۔ مجھے لگا میرے جسم کا ایک حصہ کاٹ کر لے گئے ہیں وہ ـــــ میں بہت روئی ـــــ میں کیا کر سکتی تھی؟ ایک غریب اَن پڑھ عورت۔ بس دعا کرتی رہی کہ تو وہاں ٹھیک رہے ـــــ پھر میں نے بیٹا کا جاپانی لفظ ''مُسکو'' سیکھ لیا۔ اس لفظ کو دہرا کر میں اپنی ممتا کی پیاس بجھا لیا کرتی تھی ـــــ ''مسکو ـــــ میرا رتن! ـــــ اب بھی میں ایسا ہی کر لیا کروں گی ـــــ'' ماں کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن ماں ـــــ میں جیتے جی تم سے الگ کیسے رہوں گا ـــــ؟''

''تو پھر تو یہاں آ جانا ـــــ اپنے دیس میں ـــــ تو یہاں آ جا ـــــ بس''۔ سرلا دیوی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ چند لمحے ماں کی طرف دیکھتا رہا ـــــ اسے ماں کے چہرے پر ارادے کی پختگی نظر آئی۔

اور اس نے بھی ایک دم فیصلہ کر لیا ـــــ

وہ بھی بے تحاشا! کسی غم کو بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ ایسا غم جو دب گیا تھا اور اب اچانک ابھر آیا تھا۔ کہیں یہ کسی کو چاہتے تو نہیں تھے؟ اور یہ سوچ کر پربھا تڑپ اٹھی۔

ستیش اب پوری طرح 'الکوحلک' ہو گئے تھے۔ ان کی صحت بھی خراب ہو رہی تھی اور ان کی وکالت بھی تباہ ہو رہی تھی۔ کئی کئی دن تو وہ کچہری بھی نہ جاتے۔ کہاں تو وہ بتیس برس کی عمر ہی میں کامیاب وکیلوں کے زمرے میں آ گئے تھے۔ اور کہاں اب جمی جمائی پریکٹس شراب میں ڈبو رہے تھے۔

پربھا مصرا یونیورسٹی میں لیکچرار تھی۔ اچھی تنخواہ تھی۔ شادی کے تقریباً ایک برس تک تو اس کی پوری کی پوری تنخواہ بچ جاتی تھی اور اس کا اچھا خاص بینک بیلنس بن گیا۔ شادی کے بعد جب پہلی تنخواہ اس نے ستیش کے حوالے کی تو وہ بولا "ارے یار تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ تم اپنی تنخواہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتی رہو۔ کسی بڑے خرچ کے لیے تمہاری یہ رقم کام آئے گی۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے میری آمدنی کافی ہے"۔

اور واقعی اس وقت ستیش مصرا کی آمدنی ہی سے گھر کا خرچ چل رہا تھا، اور چلتا رہا اور اب۔ اب تو نہ صرف یہ کہ پربھا کی پوری تنخواہ گھر کے خرچ میں صرف ہو جاتی تھی، اس کے بینک بیلنس کو بھی دیمک لگ رہی تھی۔ ستیش کی اپنی آمدنی سے تو اب اس کی شراب کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا اور اسے پربھا سے پیسے مانگنے پڑتے۔ پربھا پہلے تو منع کرتی، پھر اسے ترس آ جاتا۔ اس کی بے چینی بھی تو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ستیش مصرا کسی دوست کے یہاں گیا تھا۔ چلنے لگا تو دیسی شراب کا ادّھا خریدنے کے لیے دوست سے اُدھار مانگنے لگا لیکن دوست نے صاف انکار کر دیا۔ اس سے پہلے بھی وہاں سے بہت اُدھار لے چکا تھا اور اب تک ادا نہ کر سکا تھا۔ وہ اُداس سا دیسی شراب کی دُکان پر پہنچا۔ بولا "سیٹھ۔ آج بہت تھوڑی سی چاہیے"۔

اس نے جیب سے پچاس پیسے کا سکّہ نکال کر دُکاندار کے سامنے کر دیا۔

''وکیل صاحب! پچاس پیسے کی بھی کہیں شراب ملتی ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے ستیش مصرا کی طرف دیکھا۔

''ارے ایک گھونٹ تو مل سکتا ہے۔ دو چار بوندیں ہی سہی۔ نہیں تو ایک بوند تو مل سکتی ہے؟''

دکاندار ہنسنے لگا۔

''لیجئے وکیل صاحب آپ اپنی پیاس بجھا لیجئے''۔ اس نے تھوڑی سی شراب گلاس میں اُنڈیل کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا اور پھر دوسرے ہی دن یہ بات وکیل صاحب کے گھر تک پہنچا دی۔ پربھا نے سنا تو اسے یوں لگا جیسے ستیش نے اپنی ہی نہیں اس کی عزت بھی نیلام کر دی ہو! ایک تو دیسی شراب کی گھٹیا سی دُکان اور پھر بھکاریوں کی طرح شراب کی بھیک مانگنا۔ ایک پڑھا لکھا شخص ایسا بھی کر سکتا ہے؟ اُف! لیکن اس نے ستیش سے کچھ نہیں کہا، کیا کہتی۔ اب ستیش خاموش نہیں رہ پاتا تھا۔ بولنے لگتا تھا۔ بلکہ پھٹ پڑتا تھا۔

''ہاں ہاں۔ میں نہیں رہ سکتا شراب کے بغیر تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو شوق سے کہیں بھی جا سکتی ہو''۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ۔

''تم کیا سمجھتی ہو۔ میں کوشش نہیں کرتا شراب چھوڑنے کی۔ نہیں چھٹتی''۔ مجبوری اور بے بسی۔

''یاد کرو وہ دن جب میں تمہاری تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا۔ گھر کا سارا خرچ میری اپنی آمدنی سے چلتا تھا۔ اب میری آمدنی کم ہوگئی ہے تو تم یوں ہاتھ کھینچ رہی ہو؟'' شکایت اور طعنہ۔

اور انہیں شکایتوں، طعنوں، مجبوریوں، غصے اور جھنجھلاہٹ کے درمیان وقت گزرتا گیا۔ ستیش کی صحت برباد ہوتی گئی اور پربھا کا بینک بیلنس ختم ہوتا گیا۔ دونوں کا آپس میں جھگڑا بھی ہوتا رہا اور پھر صلح بھی ہو جاتی تھی اور پربھا بھی سوچتی کہ ستیش نے شراب

کی اس حد تک عادت ڈال کیسے لی۔اس نے ایک دو بار ستیش سے پوچھا۔
''آپ بتاتے کیوں نہیں؟ کس غم کو بھلانے کے لیے شراب کا سہارا لیا ہے آپ نے؟ کسی کو چاہتے تھے کیا؟ اور اس سے آپ کی شادی نہ ہو سکی اور اسے بھولنے کے لیے آپ نے شراب پینا شروع کر دی''۔اور ستیش منع کر دیتا۔
''ارے نہیں بھئی۔کوئی ایسی بات نہیں ہے۔بس پینا شروع کیا تو پیتا ہی چلا گیا۔ سچ! کوئی ایسی بات نہیں ہے''۔
اور یہ گفتگو اس وقت ہی ہو پاتی جب وہ کچھ دیر کے لیے شراب کے اثر سے آزاد ہوتا۔
اور ایک دن پربھا کو اس کی شراب چھڑانے کی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ستیش کو اچھے موڈ میں دیکھ کر بولی۔
''آپ باہر کیوں پیتے ہیں۔گھر پر پیا کیجئے نا، میں خود ساقی بن کر پلاؤں گی۔ چھ بجے شام کے قریب آپ کو طلب لگتی ہے نا۔روز اسی وقت پلاؤں گی۔آج ہی دو بوتل وہسکی منگوا کر رکھ لیتی ہوں۔پھر شراب کے لیے آپ کو مجھ سے پیسے بھی نہیں مانگنے پڑیں گے۔بولئے منظور ہے؟''
ستیش پہلے تو حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا۔پھر بولا۔
''ٹھیک ہے۔کل سے گھر پر ہی پیوں گا''۔
اور اگلے دن پربھا نے اپنے بیڈ روم کے ایک کونے کو ہی بار کی شکل دے دی۔ ایک چھوٹی سی میز کے گرد دو کرسیاں رکھ دیں اور پاس کی الماری میں وہسکی کی بوتلیں اور گلاس رکھ دیئے اور ساتھ میں نمکین کے کچھ پیکٹ۔
اپنے پلان کے مطابق پہلے دو تین دن تک تو وہ اسے اس کی مطلوبہ مقدار یعنی چار پانچ پیگ ہی پلاتی رہی اور پھر اس میں پانی کی مقدار زیادہ اور شراب کم کرتی گئی۔اور تقریباً دو ماہ کے عرصے میں چار پانچ پیگ سے دو ڈھائی پیگ پر لے آئی اور کبھی کبھی ڈیڑھ دو پیگ ہی میں اسے مطمئن کر دیتی۔ بیچ بیچ میں یہ بھی ہوا کہ ستیش خود ہی ایک دو پیگ مزید انڈیل لیتا۔

اور پربھا کو پھر چھ سات دن لگ جاتے اس بڑھی ہوئی مقدار کو کم کرنے میں۔اس کم وبیش کے چکر میں اس نے ایک عجیب بات دیکھی کہ جب بھی ستیش زیادہ نشے میں ہوتا تو وہ کچھ ایسی باتیں کرنے لگتا جو اس نے شادی کے ان دو برسوں میں اس کے منھ سے کبھی نہ سنی تھیں۔اس کے بہن بھائیوں کے بارے میں باتیں یا اس کے دوستوں کے بارے میں باتیں۔یہ دیکھ کر اسے اچانک ایک خیال آیا۔کیوں نہ وہ اسے ایک روز خود ہی زیادہ پلا دے۔اتنی زیادہ کہ وہ اپنے عشق کے بارے میں سب کچھ اُگل دے۔وہ جب بہت نشے میں ہوگا تو یقیناً سب کچھ بتا دے گا اور اسی شام اس نے ستیش کو چار پانچ پیگ نہیں بلکہ بہت زیادہ پلادی۔اتنی زیادہ کہ وہ نشے میں دُھت ہوگیا۔اتنے نشے میں ڈوب جانے کے بعد بھی وہ اور پینے کے موڈ میں تھا۔یعنی اگر پربھا خود ہاتھ نہ کھینچتی تو اسے اور پینے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔

''شبنم! تم جتنی پلاؤ گی میں پیتا رہوں گا۔تم پلاتے پلاتے تھک جاؤ گی پر میں نہیں تھکوں گا۔ڈیئر! یہ کیا کم ہے کہ تم آئی ہو مجھے شراب پلانے''۔اور اس نے نشے کی حالت میں سامنے میز پر اپنا بایاں بازو پھیلا کر اس پر اپنا سر ٹکا دیا۔اس کے منھ سے اس کی محبوبہ کا نام سن کر پربھا کو کچھ خوشی سی ہوئی کہ آخر اس نے اس کی پچھلی محبت کا اقرار کروا ہی لیا۔ اور اس سے اس کی محبوبہ کا نام بھی اُگلوا لیا اور ساتھ ہی جلن سی بھی ہوئی۔ابھی تک اسے بھولے نہیں۔ وہ چند منٹ کرسی پر بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ وہ مدہوش پڑا رہا۔ بے سدھ۔ آج انھیں ہوش میں نہیں آنے دوں گی، جب تک کہ ان کی محبت کی پوری داستان نہ سُن لوں۔کیوں نہ ہوسکی شبنم سے شادی؟ اب کہاں ہے وہ......؟''

تھوڑی دیر کے بعد ستیش نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔مدبھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور سر کو پھر بازو پر ٹکا دیا۔

اس نے جلدی سے گلاس میں شراب انڈیلی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر ستیش کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی ''اور لیں گے تھوڑی سی۔لیجئے تھوڑی سی اور لیجئے''۔

ستیش نے بغیر سر اٹھائے، ہاتھ کو جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ میں پکڑی شراب گرادی۔ غنیمت یہ ہوا کہ گلاس اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

''ارے! شراب کو ٹھکرا رہے ہیں آپ؟''

''ہاں ٹھکرا رہا ہوں۔ تمہارے ہاتھ سے نہیں پیوں گا۔ شبنم کے ہاتھ سے پیوں گا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے نکلے ان الفاظ نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے گلاس میز پر پٹک دیا اور زور سے اس کے کندھے ہلاتے ہوئے بولی۔

''کون شبنم؟ کہاں ہے شبنم''؟

''ارے ہٹو بھی'' ستیش کی کڑک دار آواز نے اسے پرے ہٹانے کی کوشش کی۔ ہٹو۔ جاؤ یہاں سے''۔

''جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ وہ غصے سے بوکھلا اٹھی۔''بولو۔ کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں میں......؟ بولو...... بولو......؟'' اس نے اسے کس کر مُکّا مار دیا اور پھر''بولو۔ کہاں جاؤں میں''۔ کہتی جاتی اور دونوں ہاتھوں سے اسے مکّے مارتی جاتی۔ ان مکوں میں شدت کم تھی۔ تیز رفتاری زیادہ۔ اب وہ رو بھی رہی تھی۔ روتی جاتی اور اسے مکے مارتی جاتی تھی۔ ستیش اس کے وار کو برابر ہاتھ سے روک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کی اس حالت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

پھر شدید غصے، رلائی اور بے قابو حالت میں اس نے ستیش کے گریبان میں ہاتھ ڈلا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔ گریبان پھٹنے لگا تو اس نے زور لگا کر اسے نیچے تک پھاڑ دیا اور پھر اس کے کرتے کو گریبان سے ہی نہیں، اس کے ایک کندھے سے بھی پھاڑ دیا۔ ستیش حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کا نشہ کافی حد تک اُتر گیا تھا۔ جب وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بیڈ کی طرف جا رہا تھا تو اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے بالکل مجنون لگ رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر گر پڑا۔ وہ بھی اٹھی اور اس ڈبل بیڈ کے اپنے حصے

پر لیٹ گئی۔ ستیش لیٹتے ہی سو گیا اور تھوڑی دیر میں خراٹے بھرنے لگا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔ بیچ بیچ میں چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھ لگ بھی جاتی اور پھر آنکھ کھلنے پر ستیش کی طرف دیکھتی تو وہ گہری نیند سو رہا ہوتا۔

ستیش کی اس حالت پر اب اسے ترس آ رہا تھا۔

''کیا فائدہ یہ سب کرنے سے؟ تو کیوں کرتی ہے یہ سب؟ مانا کہ اسے ایک لڑکی شبنم سے محبت تھی اور اس سے وہ شادی نہ کر سکا۔ کیوں نہ کر سکا؟ آج کل وہ لڑکی کہاں ہے؟ تو یہ سب جان کر کیا کرے گی؟ تمہیں وہ پیار کرتا ہے یقیناً کرتا ہے۔ تمہاری کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ تو اپنے پیار سے اس کے دل و دماغ کو پوری طرح سے جیت لے کہ وہ اسے بھول جائے۔ بھولنے کے لیے اسے شراب کا سہارا نہ لینا پڑے۔ تمہارا پیار ہی اس کا سب سے بڑا سہارا ہو! اچھا بھلا وہ شراب کم کرتا جا رہا تھا۔ امید تھی کہ کچھ دن بعد چھوڑ دے گا۔ پوری طرح سے شراب سے دور ہو جائے گا اور تجھے سوجھی کہ تو اسے شراب میں ڈبو کر اس سے اس کے عشق کے بارے میں اُگلوا لے۔ کیا مل گیا تمہیں اس خرافات سے؟ دیکھ پربھا! قوت برداشت کا دوسرا نام عورت ہے۔ اور سمجھوتے کا دوسرا نام زندگی۔ تمہیں یہ سب برداشت کرنا پڑے گا۔ اور حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں''۔ اسے لگا اسکے دماغ پر سے بوجھ اتر گیا ہے اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک چونک کر جاگی تو ستیش ابھی سو رہا تھا۔ وہ اٹھی باتھ روم گئی۔ پھر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور کچھ تازہ دم سی محسوس کرنے لگی۔ ستیش کے بیڈ کے پاس آئی۔ ستیش اب بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ ہولے سے اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور آہستہ سے اس کے ماتھے پر بکھرے بال ہٹانے لگی اور پھر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ نہایت نرمی سے ستیش جاگ نہ جائے۔

پورے ایک ماہ بعد...... جب ستیش ایک لمبے وقفے کے بعد کچہری جا رہا تھا تو وہ اس کے کالے کوٹ کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی!

ویرانہ

لگ تو یوں رہا تھا کہ جیسے اسّی برس کے اس بوڑھے کا بیاہ رچایا جا رہا ہو، لیکن ایسی بات نہ تھی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری تقریب تھی۔

نئی پوشاک پہنا کر اس کے ماتھے پر تلک لگا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر اس کی آرتی اتاری گئی۔ اس کے بعد وہاں موجود ہر شخص نے اس کے پاؤں چھوئے اور اس نے ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیرواد دی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی! تھوڑی دیر کے بعد اسے گھوڑی پر بٹھایا گیا اور اب وہ باجے گاجے کے ساتھ سب سے رخصت ہو رہا تھا۔ قصبے کی حد تک کچھ لوگ اس کے ساتھ گئے اور اب صرف اس کے دو جوان بیٹے گھوڑی کے دائیں بائیں اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ گھوڑی پر اس کے پیچھے کھانے پینے کا کچھ سامان لدا تھا، جسے وہ بار بار اپنا ہاتھ پیچھے کر کے چھو کر اس کی موجودگی کا یقین کر رہا تھا۔ قصبے کی حدود سے کافی دور آ جانے کے بعد، ایک ویران جگہ پر پہنچ کر، اس کے بیٹوں نے پہلے گھوڑی پر سے سامان اتارا اور پھر سہارا دے کر اسے اتارا جتنی مشکل سے وہ گھوڑی پر سوار ہوا تھا، اس سے بھی زیادہ مشکل سے وہ گھوڑی پر سے اترا۔ سامان اس کے پاس رکھ کر، دونوں نے اس کے پاؤں چھوئے اور واپس چل دیئے۔ اس وقت وہ انھیں آشیرواد دینا بھول گیا۔

شاید آپ نے بھی کہیں پڑھا ہو! ایک دیش میں یہ رواج تھا، کہ ایسے بوڑھے مرد یا عورت کو، جس کے لیے اب اور زندہ رہنا خود اس کے لیے اور گھر والوں کے لیے تکلیف دہ ہوجاتا تھا، دور کسی ویرانے میں کھانے پینے کا کچھ سامان دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا، جہاں کچھ عرصہ بعد بھوک سے نڈھال تنہائی کے زخموں سے چُور وہ خود ہی موت سے ہمکنار ہوجاتا۔ اگر آج کے ''اولڈ ایج ہوم'' میں رہنے والے کسی بوڑھے شخص سے اس کے گھر والے کسی بھی قسم کا جذباتی تعلق نہ رکھیں تو اس کے لیے وہ ''اولڈ ایج ہوم'' ایک ویرانہ بن کے رہ جاتا ہے۔

بابوجی کو ان کے اکلوتے بیٹے نے ان کی خود کی رضا مندی سے اولڈ ایج ہوم میں داخل کروادیا۔ اپنی بیوی سے بابوجی کی روز روز کی تکرار سے چھٹکارا پانے کا اسے یہی طریقہ نظر آیا۔ پتہ نہیں خود بابوجی کیسے تیار ہوگئے؟ دراصل اپنی بیوی کے انتقال کے بعد وہ بیٹے بہو، پوتا پوتی کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگے تھے۔ انھوں نے سوچا۔

''وہاں اولڈ ایج ہوم میں اپنے ہم عمر ملیں گے، دو چار تو دوست بن ہی جائیں گے ان کی صحبت میں وقت اچھا گزرے گا۔ کبھی کبھی گھر والے بھی ملنے کے لیے آتے رہیں گے اور اگر وہاں کا ماحول پسند نہ آیا، یا دل نہ لگا تو گھر واپس آجائیں گے۔ اپنے گھر لوٹ آنے میں کون سی بُرائی ہے؟!''

اولڈ ایج ہوم کے باسیوں نے ان کا تہہ دل سے سواگت کیا۔ چھوٹے پیمانے پر ایک گیٹ ٹوگیدر کا انتظام کیا۔ اولڈ ایج ہوم کی یہ روایت رہی تھی کہ جب بھی کوئی نووارد آتا، چھوٹا سا گیٹ ٹوگیدر ہوجاتا اور نووارد کا تعارف ہوجاتا۔ بعد میں دو چار سے اس کی گہری دوستی ہوجاتی۔

تین تین، چار چار بوڑھوں کی ٹولیاں اولڈ ایج ہوم کے وسیع لان میں اکثر بیٹھی

دکھائی دیتیں۔ مرد الگ، عورتیں الگ۔ کہیں کہیں مرد اور عورتیں اکٹھے ایک جگہ بیٹھے دکھائی دیتے۔ کبھی حالات حاضرہ پر بات چیت ہوتی۔ کبھی کسی سماجی موضوع پر۔ لیکن گھوم پھر کر بات آج کل کے نوجوانوں کی اپنے گھر کے بزرگوں کی طرف بے توجہی پر آ جاتی۔

اولڈ ایج ہوم میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ ایک ریڈنگ روم بھی تھا، ریڈنگ روم میں ہندی، اُردو، انگریزی تینوں اخبارات اور ماہنامے آتے تھے۔کئی لوگ خود اپنے اخبار اور رسالے منگوا لیتے۔ اور جنھیں پڑھنے کا زیادہ شوق ہوتا وہ لائبری سے اپنے مذاق کی کتابیں ایشو (Issue) کروالاتے۔ بابو جی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ داخل ہونے کے دوسرے ہی دن انھوں نے ہاکر کو اخبار اور کچھ ماہنامے لانے کے لیے کہہ دیا۔

جہاں تک ہوم کے خرچ کا سول تھا، تو وہ بالکل مناسب تھا، رہنے کے لیے سنگل بیڈ روم بھی تھے اور ڈبل بیڈ روم بھی۔ بابو جی ایک اچھی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے اور معقول پنشن پاتے تھے، اور پھر ان کے بیٹے نے بھی وقت ضرورت خرچ کی حامی بھری تھی۔ حالاں کہ بابو جی نے کبھی اس پر اپنے اور اپنی بیوی کے ذاتی اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد بھی نہیں۔ پنشن کے علاوہ ان کے پاس بینک میں معقول فنڈ بھی تھا۔ انھوں نے اولڈ ایج ہوم میں سنگل بیڈ روم لے لیا۔

شروع شروع میں ہر ہفتے ان کا بیٹا، بہو، پوتا، پوتی ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے لیکن ان کے وہاں پر آنے کا کوئی خاص دن مقرر نہ تھا۔ وہ لوگ اپنی سہولت کے مطابق ہفتے میں کسی بھی دن آ جاتے۔ لیکن پتہ نہیں بابو جی کو کیسے احساس ہو جاتا کہ آج وہ لوگ ان سے ملنے کے لیے آنے ولے ہیں۔ وہ صبح ہی سے ان کا انتظار کرنے لگتے۔

تین چار ماہ کے بعد، ان لوگوں کی آمد ہفتے کے بجائے دس پندرہ دن کے بعد کی ہونے لگی، اور بابو جی کی قوت احساس بھی کچھ گڑبڑا سی گئی۔ شاید اس لیے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اب بابو جی سے ملنے کی چاہ نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ صرف فرض نبھانے آتے تھے۔

ان کے گھر کا ہر آدمی اپنے کام میں بہت مصروف تھا۔ پوتا پوتی اسکول کی پڑھائی میں۔ بیٹا اپنے دفتر کے کام کی وجہ سے اکثر دیر سے گھر آتا۔ اور بہو ایک کمپنی میں ملازمت بھی کرتی تھی، اس بیچاری پر دفتر کے علاوہ گھر کے کام کا بھی بوجھ تھا۔ وہ آسانی سے کہاں نکل پاتی تھی۔ چھٹی کا ایک دن ضرور بچتا تھا۔ لیکن اس دن چینج (Change) کے لیے کچھ تفریح بھی تو چاہئے تھی۔ کبھی پکچر، کبھی باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھانا، کبھی بچوں کے ساتھ کسی پارک میں گھومنے جانا۔

پتہ نہیں وہ بوڑھا ان کی مجبوریوں کو کیوں نہیں سمجھ پا رہا تھا؟ چھٹی کے دن اسے اب بھی انتظار رہتا تھا۔ یعنی اس کا احساس اسے دھوکا دے رہا تھا!

بابو جی کے دو تین دوست بھی ان سے ملنے آیا کرتے تھے، ہوم کے باسیوں سے ملنے کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا، کسی بھی وقت ان کے ملنے والے آسکتے تھے۔ بس گیٹ پر گیٹ کیپر کے پاس رکھے رجسٹر میں اندراج کرنا ضروری تھا۔ بابو جی کے دوستوں میں اشرف صاحب آٹھ دس دن میں ایک بار ضرور آتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ گزارتے۔ جب بھی وہ آتے، بابو جی باہر لان میں بیٹھے ملتے۔ کبھی دو تین ساتھیوں کے ساتھ، کبھی اکیلے اخبار یا کوئی کتاب پڑھتے ہوئے۔ اشرف صاحب اُن کے پاس باہر ہی بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو جی انھیں ہوم کی کینٹین میں لے جاتے اور چائے سے ان کی خاطر تواضع کر دیتے۔

اُس روز اشرف صاحب آئے تو بابو جی انھیں لان میں نہیں دکھائی دیئے۔ شروع جنوری کے دن تھے، تقریباً سب ہی باہر لان میں بیٹھے دھوپ کا مزا لے رہے تھے۔ اشرف صاحب نے ایک بوڑھے شخص سے پوچھا۔

''آج وہ بابو جی نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''ان کے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے۔ آج پانچ دن ہوگئے ہیں، اپنے کمرے

میں پڑے رہتے ہیں''۔

اشرف صاحب ان کے کمرے میں چلے گئے۔ بابو جی بیڈ کی بیک پر ٹیک لگائے، نیم دراز، آدھے جسم پر کمبل ڈالے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

''ارے آؤ۔ اشرف بھائی آؤ——!'' بابو جی نے حسب معمول ان کا سواگت کیا۔

''کمرے میں پڑے ہو—— کیا ہوا؟''

''باتھ روم میں پھسل گیا تھا یار۔ پاؤں میں چوٹ آ گئی ہے''۔ بابو جی نے اپنی بائیں ٹانگ پر سے کمبل ہٹا کر دکھایا۔ ان کے پاؤں پر کریپ بینڈیج بندھی تھی۔ انھوں نے کمرے میں ہی چائے منگوائی۔ باتوں باتوں میں اشرف صاحب کو پتہ چلا کہ پچھلے بیس بائیس دن سے ان سے گھر والے ملنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ اشرف صاحب نے محسوس کیا کہ ان کی باتوں میں وہ گرمی، وہ جوش نہ تھا، جو ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ وہ اچانک بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے۔ ان کا دھیان کہیں اور چلا جاتا۔

''اتنا وقفہ تو پہلے بھی ہو جاتا تھا، ان کے گھر والوں کے آنے میں۔ لیکن وہ اس بات سے کبھی اتنے پریشان نہیں ہوئے تھے۔ پھر آج کیوں دُکھی لگ رہے ہیں؟'' اشرف صاحب سمجھ نہ سکے اور نہ ہی انھوں نے بابو جی سے اس بارے میں بات کی۔ کچھ دیر کے بعد، جلد آنے کا وعدہ کر کے وہ ان سے رخصت ہوئے۔

ابھی وہ پھاٹک سے ادھر ہی تھے کہ انھیں چپراسی کی آواز سنائی دی——

''صاحب! صاحب آپ کو منیجر صاحب یاد کر رہے ہیں''۔

اشرف صاحب کچھ حیرت زدہ سے منیجر کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''تشریف رکھئے!'' منیجر صاحب نے اپنے سامنے رکھی فائل ہٹاتے ہوئے کہا۔

''آپ تو بابو جی کے گہرے دوست ہیں——؟ ہے نا؟''

''جی۔ ہاں۔ جی ہاں''۔

''تو آپ ان کے گھر والوں سے کہیے گا کہ چند روز کے لیے وہ انھیں گھر لے جائیں۔''

''جی۔کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں! خاص بات ہی سمجھیے۔ ہی نیڈز ہزاون پیپلز کمپنی (He Needs his-own people's company) کچھ دن کے لیے گھر میں رہیں گے تو ان کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ اب دیکھیے نا! ڈاکٹر نے ان کے پاؤں کا ایکس رے کروایا ہے،کوئی ایسی چوٹ نہیں ہے جو وہ اتنا محسوس کرر ہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کریپ بینڈیج باندھ کر چلنے پھرنے سے قطعی منع نہیں کیا۔لیکن بابو جی پچھلے پانچ دن سے کمرے ہی سے نہیں نکلے۔ اب یورین باٹل، مانگ رہے ہیں۔ صبح ایک بار باتھ روم جانے کے بعد دوبارہ باتھ روم تک بھی نہیں جانا چاہئے''۔

اشرف صاحب وہاں سے سیدھے بابو جی کے گھر گئے___ ان کا بیٹا گھر ہی پر تھا۔

''آیئے انکل! ویل کم___ آج آپ بہت دن بعد آئے''۔

بابو جی کے بیٹے نے ان کا تہہ دل سے استقبال کیا۔انھوں نے دیکھا، گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ کچھ ایسے چہرے بھی دکھائی دیئے جو باہر سے آئے تھے اور بابو جی کے ذریعہ اشرف صاحب سے متعارف بھی تھے۔ ان میں سے دوتین نے اشرف صاحب کو سلام بھی کیا۔ اور چائے کے دوران ان کے پاس آبیٹھے۔ بڑی مشکل سے اشرف صاحب کو بابو جی کے بیٹے سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مل پایا۔ انھوں نے منیجر صاحب کی بات اور بابو جی کی حالت کے بارے میں اسے تفصیل سے بتادیا۔

''انکل! وہ تو ٹھیک ہے،لیکن کل ہمارے گھر میں ایک تقریب ہے، اس کے بعد ہی انھیں لاسکیں گے''۔

ان کے بیٹے نے اپنی بات کی وضاحت بھی کردی___

''انکل ۔آپ تو جانتے ہیں ان کی عادت۔ ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی ، Un wantedان وانٹیڈ advice ایڈوائس دینے کی۔ ہم اپنے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتے''۔

اشرف صاحب حیران رہ گئے۔انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ سب بابو.جی کا بیٹا کہہ رہا تھا!!

'ارے ! گھر میں رونق ہے، اس سے تو بابو.جی کا دل یقیناً بہل جائے گا! خیر، جیسا بھی یہ لوگ ٹھیک سمجھیں'!

اشرف صاحب نے ان کے بیٹے سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔لیکن جب وہ وہاں سے لوٹے تو بہت بے چین تھے۔

اگلے دن وہ اپنے دوست سے ملنے اولڈ ایج ہوم میں نہ جا سکے۔لیکن وہ دن بھر بے چین رہے۔

تیسرے دن وہ صبح آٹھ ہی بجے وہاں پہنچ گئے۔

بابو.جی کے کمرے کے اندر اور باہر بھیڑ جمع تھی۔ پتہ چلا رات میں نہ جانے کس وقت ان کا انتقال ہو گیا تھا!

بابو.جی کا چہرہ کھلا ہوا تھا، جھریوں بھرے اس چہرے پر دُکھ بھری مسکان تھی۔ ان کے دونوں ہاتھ کمبل سے باہر نکل کر ان کے سینے پر تھے۔ان ہاتھوں میں ایک نہایت خوبصورت گریٹنگ کارڈ تھا جس پر لکھا تھا۔

''اپنے بہت ہی پیارے پوتے راہل کو، اپنے دادو کی طرف سے
جنم دن مبارک!''

دشمن

وقت دولت ہے۔ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے اور اپنے اسی ایک ایک منٹ کا حساب لگاتے ہوئے لاچت رائے نے جیسے اچانک ایک نئی چیز دریافت کر لی! دن بھر کے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ گھنٹے دفتر کے نکال کر باقی وقت میں اگر کوئی کام جب زیادہ وقت لے لیتا ہے تو وہ ہے نیند۔ پورے سات گھنٹے اور کبھی کبھی ساڑھے سات یا آٹھ گھنٹے! یعنی دن بھر کا تیسرا حصہ۔ انسان کی زندگی کا تیسرا حصہ! اور یہ کتنا بڑا نقصان ہے؟ وہ آج تک جان ہی نہ سکا کہ یہ وقت آخر جاتا کہاں ہے؟ چوبیس گھنٹے اتنی جلدی کیسے گزر جاتے ہیں؟ اب معلوم ہوا کہ یہ سب نیند کی وجہ سے ہے۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جیسے اس نے اپنے کسی دشمن کا پتہ لگا لیا ہو۔ گھر میں چھپے دشمن کا! وہ آج کئی دن سے پریشان تھا اس بات سے کہ وہ جتنے کام دن بھر میں کر ڈالنا چاہتا تھا ان کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہ بچتا تھا۔ وہ کام جن سے روپیہ پیدا ہو سکے۔ محنت سے، دوڑ دھوپ سے، کام پورے نہ ہو پاتے اور دن گزر جاتا۔ اور کلینڈر پر دوسری تاریخ بدل دینا پڑتی۔

دفتر کے بعد وہ ایک دوسری جگہ جہاں وہ پارٹ ٹائم نوکری کرتا تھا چلا جاتا۔ دو گھنٹے وہاں کام کرنے کے بعد دوڑا دوڑا گھر جاتا۔ جلدی جلدی کھانا کھاتا۔ اور پھر بیگ

اٹھا کر بزنس کے لیے آرڈر، حاصل کرنے مارکیٹ چلا جاتا۔ اس نے کلینڈر بنانے والی ایک فرم کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ ایک چھوٹی سی کمپنی بھی کھول رکھی تھی ۔جس میں کچھ چیزیں اس نے اپنی تیار کی تھیں۔ جیسے چوہے مار گولیاں، کھٹمل مار پاؤڈر اور مکھی برانڈ فینائل اور اب ان چیزوں کو مارکیٹ میں چلانا چاہتا تھا۔ ان چیزوں کا آرڈر لینے ،ایجنسی کے کلینڈروں کا آرڈر لینے آٹھ بجے سے دس ساڑھے دس بجے تک مارکیٹ کا چکر لگاتا ہوا اس وقت لوٹتا جب دُکانیں بند ہونے لگتیں۔ گھر آکر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے ٹائپ کا کام کرنا ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کے طلباء کے تھیسس ٹائپ کرنے کا کام جو وہ چھٹی کے دن ان کے ہوسٹلوں میں چکّر لگا کر، مناسب معاوضہ طے کر کے خود لے آتا تھا۔ وہ یہ کام رات کو مارکیٹ سے واپس آنے کے بعد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس وقت کر نہ پاتا، نیند اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ کرتی اور وہ اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا۔ وہ سوجاتا اور ٹائپ کا کام صبح کے لیے رہ جاتا۔ لیکن صبح اسے اپنے بزنس کا حساب کتاب کرنا ہوتا تھا۔ خط لکھنے ہوتے تھے۔ صبح پانچ ساڑھے پانچ بجے اٹھتا۔ کچھ وقت ٹائپ میں گزارتا اور کچھ اپنی کمپنی کے کام میں۔ اور دفتر چل دیتا۔ ایسا لگتا جیسے وہ انسان نہ ہو، ایک مشین ہو۔ نہ تھکنے والی مشین۔ ایک ہی رفتار سے چلنے والی مشین۔

دفتر کے علاوہ دوسرے کاموں سے وہ ابھی تک اپنی آمدنی میں کچھ خاص اضافہ نہ کر پایا تھا۔ دفتر میں وہ ایک کلرک تھا۔ گھر کے اخراجات نکال کر وہ بہت تھوڑا سا روپیہ جمع کر سکا تھا۔ لیکن اس تھوڑے سے جمع روپے نے بھی اس کا لالچ تیز کر دیا تھا۔ وہ اسے جلد سے جلد بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی آمدنی کیسے بڑھائے؟ وہ اپنا بینک بینس کیسے بڑھائے؟ یہی چنتا اسے ہر وقت لگی رہتی۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ جس طرح کا بزنس وہ کرتا تھا، اس میں نفع بہت کم تھا۔ صرف زیادہ کام کرنے سے ہی آمدنی زیادہ ہوسکتی تھی۔ اور زیادہ کام کرنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔ کتنا ہی ٹائپ کا کام دھرا رہ جاتا۔ اور دفتر کا وقت

ہو جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ وقت کی تنگی کی وجہ سے تھا۔ اگر اس کے پاس اور وقت ہوتا تو وہ اس سے زیادہ، کئی گنا زیادہ کام کر سکتا تھا۔ آمدنی بڑھا سکتا تھا۔ لیکن چوبیس گھنٹے ہی کا تو دن ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کا تو ہوتا نہیں۔ وہ کرے بھی تو کیا کرے؟ ہاں البتہ ان چوبیس گھنٹوں کو ایک ایک منٹ کو روپے میں بدل ڈالے تو اس کی آمدنی بلاشبہ بڑھ سکتی ہے۔ اور یہی سوچتے ہوئے روپے اور وقت کا حساب لگاتے ہوئے، اس نے نیند کی ''کھوج'' نکالی تھی۔ نیند اس کی سب سے بڑی دشمن!

انسان سوتا کیوں ہے؟ وہ چوبیس گھنٹے جاگتا ہی کیوں نہیں رہتا؟ کیا نیند اس کی صحت کے لیے ضروری ہے اور وہ بھی چھ سات یا آٹھ گھنٹے کی نیند؟ یہ سوال تھے جو اتنے دنوں سے لاچپت رائے کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اسے اچانک نیند سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہی نفرت جو ایک دشمن کے لیے ہوتی ہے۔ وہ اپنی نیند کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ نیند ہی ہے جو اس کے روپے کمانے کے راستے میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اور اب اس نے اپنا یہ نظریہ بنالیا تھا کہ نیند صرف ایک عادت ہے، ضرورت نہیں۔ وہ بھول گیا کہ بچہ اپنی پیدائش کے بعد بیس بائیس گھنٹے سوتا رہتا ہے۔ اس وقت یہ اس کی ضرورت ہوتی ہے عادت نہیں۔ اور پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، نیند کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ضرورت کم ہوتی جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ انسان سوتا کیوں ہے؟ بلکہ یہ ہے کہ انسان سترہ اٹھارہ گھنٹے جاگتا کیوں ہے؟ جب کہ پیدا ہونے کے بعد بیس بائیس گھنٹے سوتا ہے! لیکن جتنی بھی نیند رہ جاتی ہے وہ انسان کے لیے، اس کے اعصاب کے لیے یقیناً ضروری ہوتی ہے۔ بہت ضروری۔ اس میں شک کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ لیکن لاچپت رائے نے یہ نہیں سوچا۔ اس پر تو یہ دھن سوار تھی کہ نیند کو کس طرح کم کیا جائے اور کس طرح ختم کر دیا جائے۔ کچھ دنوں کی سوچ نے آخر اسے ایک ترکیب سجھا ہی دی۔ وہ پہلے ماہ نیند میں سے ایک گھنٹہ کم کرے گا۔ پھر دوسرے

ماہ آدھا گھنٹہ اور گھٹا دے گا۔ تیسرے ماہ بھی آدھا گھنٹہ اور اس کے بعد ہر ماہ پندرہ منٹ۔ اسی طرح پندرہ منٹ ہر ماہ گھٹاتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ نیند کا وقت بہت تھوڑا رہ جائے گا۔ نہ ہونے کے برابر۔ اور ہوسکتا ہے وہ نیند پر مکمل فتح حاصل کرلے۔ اسے اپنی عادت ہی تو بدلنی ہے۔ ایک غلط عادت! اور اسے یہ پلان سوچ کر بہت خوشی ہوئی۔ صرف یہ نہیں کہ وہ نیند میں ضائع ہونے والے وقت سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ بلکہ یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ انوکھا لیکن کامیاب تجربہ!

لاجپت رائے ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اگرچہ اس کی عمر اس وقت اٹھائیس برس کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شادی سے پہلے اس کا بینک بیلنس ضرور ہونا چاہیے۔ اس وقت وہ اکیلا ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہ رہا تھا۔ جب اس نے یہ پلان بنایا تو اسے اطمینان ہوا کہ اس کا غیر شادی شدہ جیون اس پلان کو کامیاب بنانے میں مددگار رہوگا۔ اتنا اہم تجربہ اکیلے رہ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بھی اچھا ہے کہ گھر کے دوسرے لوگ اس کے پاس نہیں ہیں۔ ورنہ وہ شاید اس کی ہمت کم کرنے کی کوشش کرتے۔

پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ایک ٹائم پیس خریدی، جس کے الارم کی مدد سے وہ مقررہ وقت پر جاگ سکے۔ ایک سستا سا اسٹوو خریدا، جس پر چائے بنا کر وہ وقت پڑنے پر خود کو تازہ دم کرسکے۔ اور پھر اپنے چوبیس گھنٹوں کا ایک نیا ٹائم ٹیبل بنایا۔ اور دوسرے دن سے اپنی پوری توجہ کے ساتھ اس نے دشمن کو جیتنے کی لڑائی شروع کردی۔

اپنے پلان کے مطابق لاجپت رائے پہلے تین مہینوں میں اپنی نیند کو چار گھنٹوں تک لے آنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس نے پلان میں تھوڑی سی تبدیلی کی۔ اس نے نیند کو اور کچھ عرصہ کے لیے اسی حد تک رکھنا مناسب سمجھا۔ وہ اگلے دو ماہ میں بھی چار گھنٹہ ہی سوتا رہا۔ وہ سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کہیں جلد بازی اس کا پلان ہی چوپٹ نہ کردے!

اب اسے نیند میں پندرہ منٹ کم کرنے تھے۔ اگلے دو ماہ میں وہ نیند کو ساڑھے تین گھنٹے تک لے آیا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس سے یہ حد مستقل طور پر قائم نہیں ہو پا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسے چار گھنٹے اور کبھی کبھی پانچ گھنٹے کی حد تک پیچھے ہٹنا پڑ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پوری طاقت سے اسے آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ تین ماہ اور بیت گئے اور وہ ساڑھے تین گھنٹے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے ان دنوں اپنے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا۔ وہ ہلکی اور صحت بخش غذا لے رہا تھا۔ کچھ احتیاط کی وجہ سے اور کچھ بینک بیلنس کے تھوڑا سا بڑھ جانے کی وجہ سے، ابھی تک اس کی صحت پر کچھ برا اثر نہیں پڑا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھا۔ اس نے سوچا کہ پندرہ منٹ فی ماہ کے بجائے اب وہ دس منٹ فی ماہ کم کرے گا۔ آخر نیند کو زندگی بھر کے لیے وداع تو ہو ہی جانا ہے، لینے دو اسے کچھ وقت اور! وہ ایسے سوچ رہا تھا جیسے کوئی قید میں آئے ہوئے دشمن کے بارے میں سوچتا ہے۔ اسے مار تو دینا ہی ہے، جی لینے دو اسے کچھ عرصہ اور۔

اگلے تین ماہ میں وہ نیند کو تین گھنٹے تک لے تو آیا لیکن یہاں پہنچ کر اسے ایک عجیب سی تکان محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے، جو اس کے سانولے رنگ کے باوجود صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ دشمن کے ساتھ لڑائی کے وقت کچھ زخم تو لگتے ہی ہیں۔ اور اس نے اس تکان کی، ان سیاہ حلقوں کی کچھ پروا نہ کی۔ اس نے پوری ہمت سے کام لیا۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ کسی کسی دن ٹائم پیس کا الارم بج بج کر خاموش ہو جاتا اور اٹھنا چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ نہ پاتا۔ اس دن وہ تین گھنٹے کے بجائے چار ساڑھے چار گھنٹے چار پائی پر پڑا رہتا۔ نہ وہ پوری نیند ہوتی اور نہ پوری طرح جاگنے کی حالت۔ بعد میں اسے دُکھ ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا، لیکن پھر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا۔

کتنے ہی دن بیت گئے اور لاجپت رائے اپنی اس تین گھنٹے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس بات کا اسے بہت دکھ تھا۔ ہلکی ہلکی تھکاوٹ جو وہ اکثر محسوس کرتا تھا اس کے دُکھ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ ایک دن اس نے ایک بھرپور وار کرنے کی سوچ لی۔ آج وہ تین گھنٹے کے بجائے دو گھنٹے سوئے گا۔ صرف دو گھنٹے، چاہے کچھ بھی ہو جائے، صرف دو گھنٹے۔

وہ ایک بجے تک جاگتا رہا۔ آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار لیتا۔ ڈیڑھ بج گیا اور پھر دو بج گئے۔ اور اس نے چار بجے کا الارم لگایا اور چارپائی پر لیٹ گیا، لیکن یہ کیا؟ اسے نیند نہیں آ رہی تھی! یہ نیند کہاں چلی گئی؟ وہ آدھا گھنٹہ لیٹا رہا، لیکن نیند نہ آئی۔ ایک گھنٹہ بیت گیا، لیکن نیند کو نہ آنا تھا، نہ آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اچانک اس میں نیند کی زبردست خواہش جاگ اٹھی تھی۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔ آنکھیں جلتی ہوئی سی لگیں۔ اور دماغ بوجھل سا۔ جیسے کسی نے اس کے دماغ میں سیسہ بھر دیا ہو۔ آج ...... آج نہ جانے کیا بات تھی؟ وہ سونا چاہتا تھا لیکن سو نہیں پا رہا تھا ...... یہ کیا تھا؟ اور وہ صبح دفتر نہ جا سکا۔

لگاتار تین دن دفتر سے چھٹی لینے کے بعد ایک منٹ بھی نہ سو سکنے کے بعد، کوئی بھی کام نہ کر سکنے کے بعد جب وہ شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر بولا

''مسٹر! تمہیں انسومنیا (Insomnia) ہو گیا ہے۔ سخت قسم کا انسومنیا۔ دماغ میں نیند کے مرکز بری طرح خراب ہو گئے ہیں۔ اور انھیں ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ کافی وقت۔ بس یوں سمجھو کہ نیند تم سے روٹھ گئی ہے!''

سُبحان اللہ!

ببن میاں کی گود میں بیٹھا سات آٹھ کا ماہ کا وہ بچہ اپنی معصوم نگاہوں سے کبھی ان کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی ان کی بیگم کے چہرے کو ـــــ اور جواب میں ببن میاں کی روح کی گہرائیوں سے نکلی مسکراہٹ پان کی لالی سے رنگے ان کے ہونٹوں پر بکھر بکھر جاتی ـــــ پاس میں کھڑی ان کی بیگم اور ان کی دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ـــــ گورے رنگ کا گول مٹول سا وہ بچہ ان سب کی مسکراہٹوں سے بے خبر، کچھ حیرت زدہ سا بار بار صرف ببن میاں اور ان کی بیگم کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھا کر ببن میاں کے منھ کو جیسے نوچ لینے کی کوشش کی اور روتا ہوا ان کی بیگم کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔ ببن میاں نے اسے پچکارتے ہوئے اپنی گود میں بٹھائے رکھنا چاہا لیکن وہ چپ نہ ہوا۔ ان کی گود میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

''لو بھئی! اب یہ تمہارے پاس آنا چاہتا ہے''۔ ببن میاں نے کھسیاتے ہوئے بچہ کو اپنی بیگم کی طرف بڑھایا۔

''ابا ـــــ ! یہ ابھی آپ سے ہلا نہیں ہے نا ـــــ اس لیے ـــــ '' ان کی بڑی بیٹی بولی، اور چھوٹی نے کہا ـــــ

''آپ سے ناراض ہے شاید؟''

''ارے ناراض کیوں ہے؟ پہلی بار آیا ہے میرے پاس ـــــ ہلا نہیں ہے۔ ویسے بچہ بہت ہی پیارا ہے۔ تم کل اس کو پھر لے آنا ـــــ دو چار بار آئے گا تو ہل جائے گا''۔

انھوں نے بیگم سے کہا اور محبت بھری نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اب وہ بچہ ان کی طرف دیکھتا بھی تو آنسو بھری سہمی ہوئی نگاؤں سے اور پھر ان کی بیگم کے سینے سے منھ چھپالیتا۔ ببن میاں کو اس کی یہ ادا اور بھی پیاری لگی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ بیگم سے بچے کو لے لیں اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیں۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو سینے میں دبا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ان کی بیگم اس بچے کو گود میں اٹھائے مکان میں داخل ہوئی تھیں تو ببن میاں برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بچے کو دیکھتے ہی ان کے منھ سے نکلا۔

''ارے! بڑا خوبصورت بچہ ہے! کس کا ہے؟''

''اسلم میاں کا پوتا ہے''۔

''اچھا! اسلم میاں کا پوتا ہے؟ کتنا خوبصرت ہے۔ سبحان اللہ!''

انھوں نے اسلم میاں کسے بیٹے اور بہو دونوں کو دیکھا تھا۔ سانولے رنگ کا معمولی سی شکل وصورت کا جوڑا ـــــ نہ اسلم میاں خوش شکل اور نہ ان کی بیوی...... یہ بچہ کس پر گیا ہے؟! قدرت ہی کا کوئی کھیل ہے''۔ وہ حیرت زدہ تھے۔

اسلم میاں ان کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان کی گلی کے پچھواڑے والی گلی میں رہتے تھے۔ شادی کے دس سال بعد اسلم میاں کے بیٹے کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اور ان کی بیگم دونوں انھیں مبارک باد دینے گئے ـــــ اس کے بعد ببن میاں تو اسلم میاں کے یہاں کبھی نہیں گئے لیکن ان کی بیگم کبھی کبھی جاتی رہیں ـــــ اور اب اسلم میاں کا پوتا آٹھ ماہ کا ہو رہا تھا۔

دوسرے دن ان کی بیگم اس بچے کو نہیں لائیں ___ ببن میاں کو کچھ خلش سی ہوئی۔ لیکن انھوں نے بیگم سے استفسار نہیں کیا۔ جب وہ اگلے دو دن بھی اسے نہ لائیں تو ببن میاں سے رہا نہیں گیا ___

''ارے بھئی! اسلم میاں کے پوتے کو لے آتیں نا ___ اس بچے نے تو ہمارا دل موہ لیا ہے۔ سچ!''

''میں گئی تھی ان کے یہاں ___ جب بھی گئی وہ سوتا ہوا ملا۔ اب سوتے ہوئے بچے کو تو اٹھا کر نہیں لاسکتی تھی نا ___ کل پھر جاؤں گی۔ آپ کی خاطر''۔ وہ انھیں چھیڑنے کے انداز میں مسکرادیں۔

اور دوسرے دن وہ سچ مچ اسے لے آئیں۔ اور اب وہ جھٹ ان کی گود میں چلا گیا۔

''دیکھا ___!'' ببن میاں نے فاتحانہ انداز میں بیگم کی طرف دیکھا ___ ان کی دونوں بیٹیاں بھی پاس آگئیں اور بچے کو ابا کی گود میں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''ابا! اب سمجھئے کہ یہ بچہ آپ کے ساتھ ہل مِل گیا ہے''۔ بڑی بیٹی نے کہا، اور چھوٹی اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''یعنی ___ اب یہ آپ سے ناراض نہیں ہے ابا''۔

ببن میاں نے ہنستے ہوئے بچے کو گدگدایا ___ ''کیوں بے شیطان! ناراض تھا تو مجھ سے؟''

بچہ مسکرانے لگا۔ ببن میاں نے اسے سینے سے چمٹالیا۔

اور اب ان کی بیگم تقریباً ہر روز بچے کو لانے لگیں اور ببن میاں اس کے ساتھ دل بہلانے لگے۔ کبھی اسے کوئی بسکٹ پکڑا دیتے، کبھی چمچہ سے اسے حلوہ کھلاتے اور کبھی میش (Mesh) کیا ہوا کیلا یا اسی طرح کی کوئی اور چیز ___ دو تین کھلونے بھی خرید لائے ___ قلابازی کھانے والا بندر، چابی سے چلنے والی موٹر، پٹری پر چلنے والی ریل

گاڑی ــــ اسے گود میں لیے ان کھلونوں کو چلاتے اور اسے خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتے۔ اگر کبھی تین چار دن کا وقفہ ہوجاتا تو وہ اپنے پچھواڑے والی گلی میں سے ہوکر اپنے گھر آتے جاتے۔ ایک نظر اس بچے کو دیکھ پانے کی امید میں۔ لیکن وہ اسلم میاں کے گھر کبھی نہیں گئے ــــ انھیں بڑا عجیب سا لگتا، جب وہ اس سے پہلے ان کے یہاں کبھی نہیں گئے تھے تو اب ان کے پوتے کی خاطر ان کے یہاں کیوں جائیں؟ یہ انھیں اپنا سستا پن لگتا۔ لیکن ایک بار پچھواڑے والی گلی سے نکلتے ہوئے انھیں گلی کے موڑ پر اسلم میاں مل گئے۔ انھوں نے نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا ــــ

''کہئے اسلم میاں! کیسے حال چال ہیں؟''

''خدا کا شکر ہے۔ آپ سنائیے ــــ کبھی غریب خانے پر بھی تشریف لائیے نا ــــ سامنے سے نکل جاتے ہیں آپ''۔

''ارے نہیں۔ ایسے ہی آج ادھر سے نکل آیا۔ آؤں گا۔ آپ کے یہاں ضرور آؤں گا۔ اور سب خیریت ہے نا؟ آپ کا...... آپ کا پوتا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے''۔

''خدا اُسے نظر بد سے بچائے۔ بہت خوبصورت بچہ ہے''۔

''جی؟! ــــ جی ہاں۔ اب وہ جیسا بھی ہے۔'' اسلم میاں نے ان کی بات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ ''بچے تو سب ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دل کی نگاہوں سے دیکھے''۔

''جی ہاں۔ درست فرمایا آپ نے۔ اچھا چلتے ہیں۔ بچے کو میرا پیار دیجیے گا''۔

اور اسلم میاں کچھ عجیب نظروں سے انھیں دیکھتے اور ''ہاں'' میں سر ہلاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔

بنّن میاں مسکراتے ہوئے وہاں سے بازار کی طرف چل دیئے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت سا نیکر اور ایک قمیص خریدی اور ڈبے کو ہاتھ میں پکڑے سامنے والی مسجد میں

داخل ہوگئے۔ نماز ادا کی۔ جب وہ نماز ادا کر رہے تھے تو اسلم میاں کا پوتا بار بار ان کے خیالوں میں آرہا تھا۔ ان کا خریدا ہوا سوٹ پہنے۔ کھلونوں سے کھیلتا ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ گھر لوٹ رہے تھے تو سوچ رہے تھے کہ جاتے ہی بیگم سے کہیں گے آج اسے ضرور لے آئیں۔

جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے، انھیں بیگم ملیں۔ اس بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے۔

''ارے واہ! بھئی آج تو ہم جو کچھ بھی مانگتے مل جاتا''۔ انھوں نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ''تم اسے کب لے آئیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم......''

وہ آگے رک گئے۔ یہ نہیں کہا کہ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسلم میاں سے ملے تھے''۔

''ابھی تو لائی ہوں۔ دس پندرہ منٹ پہلے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''اچھا یہ لو ـــــ'' انھوں نے ہاتھ میں پکڑا ڈبہ کھولا ـــــ ''ہم اس کے لیے یہ سوٹ خرید لائے ہیں''۔

''ارے واہ!'' بیگم نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

''اب تم ایسا کرو، اسے یہ کپڑے پہنا دو''۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ شام کو لیتی جاؤں گی نا اس سوٹ کو ـــــ اس کی ماں کو دے دوں گی''۔

''اور اگر تم اسے ابھی پہنا دو ـــــ تو کوئی حرج ہے؟''

''اچھا بابا''۔

اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، تو وہ سوٹ پہنے بچے کو گود میں بٹھائے ہوئے تھے۔ خود بھی کھانا کھا رہے تھے اور چاول دال ملا کر اپنے ہاتھ سے اسے بھی کھلا رہے تھے۔ اچانک بیگم سے بولے۔

''اس عمر میں ایک چھوٹے سے پوتے کو گود میں کھلانے کا دل کرتا ہے ـــــ ہے

نا؟ کاش! ہمارا اپنا بھی ایک چھوٹا سا پوتا ہوتا___!!''

''ارے ابا! آپ کا پوتا ہی تو ہے یہ___'' ان کی چھوٹی بیٹی جو اُن کے سامنے بیٹھی تھی، بولی۔

''وہ ہنس دیئے___ ''ہاں وہ تو ہے___ کسی دوسرے کا بچہ ہوا یا اپنا کیا فرق پڑتا ہے۔ بچے تو سب کے ساجھے ہوتے ہیں۔ سچ مچ کبھی دوسرے کے بچے سے بھی اپنے بچے کا سا پیار ہو جاتا ہے''۔

اب کی بڑی بیٹی بولی___

''ہاں! ہو جاتا ہے۔ ضرور ہو جاتا ہے۔ پر ابا! یہ سچ مچ آپ کا اپنا پوتا ہے''۔

اب وہ ذرا سنجیدہ ہو گئے۔

''کیا بک رہی ہو تم؟''

اور انھوں نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا، سوالیہ نگاہوں سے۔ وہ ڈری سی بولیں

''جی...... جی ہاں۔ یہ راجے کا بیٹا ہے''۔ اور وہ ایک دم بھڑک اُٹھے___

''نام نہ لو۔ اس نالائق کا میرے سامنے''___ اور انھوں نے آہستہ سے بچے کو اپنی گود سے ہٹانے کی کوشش کی۔

ان کے سب سے چھوٹے بیٹے راجے نے دو برس ہوئے ان کی مرضی کے خلاف ایک معمولی خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اور انھوں نے اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیا تھا، اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھوڑی دور ایک دوسری کالونی میں رہ رہا تھا۔ بنّن میاں اسے عاق کرنے کی سوچ رہے تھے۔

بیگم اٹھیں اور ان کی گود سے بچے کو لینے لگیں۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ بچے کو اپنی گود ہی میں رہنے دینا چاہتے تھے!

اور اسی شام کو وہ اپنے اس چھوٹے بیٹے اور بہو کو گھر میں داخل کر رہے تھے!!

زلزلہ

ایک زلزلہ اس کی زندگی میں اس وقت آیا تھا جب چھ برس پہلے اس کا شوہر سری نواس پاریکھ اچانک اس کو، دو بیٹیوں اور اچھے خاصے چلتے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اور ایک زلزلہ 26 رجنوری 2001ء کو آ گیا۔ جس نے صرف اسی کو نہیں، احمد آباد کے کئی گھروں کو تباہ کر دیا ـــــــ چھ برس پہلے آئے اس زلزلے نے صرف اس کے شوہر کو اس سے الگ کیا تھا۔ لیکن اس زلزلے نے احمد آباد کے علاوہ گجرات کے کئی شہروں میں تباہی مچا دی تھی۔ کئی خاندانوں کے آدھے سے زیادہ افراد کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ صرف چند سیکنڈ میں اتنی بڑی تباہی لانے والا یہ زلزلہ قدرت کی طرف سے تھا لیکن اس کی اپنی زندگی میں جو زلزلہ چھ برس پہلے آیا تھا وہ قدرت کی طرف سے ہرگز نہیں تھا ـــــــ وہ اس کا اپنا لایا ہوا تھا۔ اس کی اپنی فطرت کی وجہ سے تھا۔ اس کی فطرت جو شادی کے چھ برس بعد بھی سُدھر نہ سکی تھی!

سلوچنا پاریکھ اور سری نواس پاریکھ سگائی سے پہلے پورے تین ماہ تک ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے۔ یعنی دونوں میں کورٹ شپ چلتی رہی تھی۔ لیکن اس مختصر سی کورٹ شپ میں دونوں کی کمزوریاں ایک دوسرے کے سامنے نہیں آ سکی تھیں۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس مختصر سی مدت میں خارجی خوبیوں ہی کا غلبہ رہا تھا۔ اندرونی

کمزوریوں کو دونوں ہی نے درگزر کردیا تھا۔ سلوچنا کی فطرت تھی کہ معمولی سی بات کو بھی بحث کی شکل دے دیتی۔ کسی بھی موضوع پر کوئی بات کرتا، وہ جھٹ اس کا تضاد پیش کردیتی۔ اور پھر وہ بات بحث میں بدل جاتی۔ بحث میں گرم اور اونچی آواز شامل ہوجاتی اور دونوں فریقین تناؤ کا شکار ہوجاتے اور جب یہ بحث سری نواس کے اور اس کے درمیان ہوتی تو عورت ہونے کے ناطے وہ خود تو آنسو بہا کر تناؤ سے آزاد ہوجاتی لیکن سری نواس کتنی ہی دیر تک اندر ہی اندر دکھی رہتا۔

اور ایک دن اسی تناؤ کا مارا وہ چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ سکون کی تلاش میں!

سلوچنا آرکیٹکٹ تھی اور سری نواس سول انجینئر ——— شادی کے بعد دونوں نے مل کر احمد آباد میں انجینئرنگ کنسل ٹینسی کھول لی تھی۔ زیادہ تر وہ پرائیویٹ بلڈرز کے لیے کام کرتے تھے۔ احمد آباد ہی میں نہیں احمد آباد سے باہر بھی۔ عمارت کے آرکیٹکچر کے علاوہ ان کے کام میں عمارت کی بنیاد کا مناسب اور صحیح ڈیزائن بھی شامل تھا۔ زمین کے اندر کتنی گہرائی تک بنیاد لے جانی چاہئے اور کس طرح کی بنیاد ہونی چاہئے۔ اس کے لیے وہ بنیاد کے نیچے بورنگ کروا کر مناسب گہرائی تک کی مٹی کی خصوصیات کی جانچ کرواتے اور بنیادی مٹی کی بوجھ برداشت کرنے کی قوت کا جائزہ لیتے۔ اور اگر کوئی شہر زلزلے کے خطّے میں واقع ہوتا تو اس کے لیے مناسب فیکٹر آف سیفٹی لگایا جاتا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ خود انھوں نے اپنے لیے ایک ایسی عمارت میں فلیٹ خرید لیا تھا جس کے بنانے سے پہلے بلڈر نے کسی قسم کی جانچ نہیں کروائی تھی اور نہ ہی اس بات کا خیال رکھا تھا کہ احمد آباد زلزلے کے خطّے میں واقع ہے۔ یعنی عمارت کے تحفظ کو اپنے منافع پر قربان کردیا تھا۔ سرینواس کا عقیدہ تھا کہ زیادہ زلزلے والے خطّے میں تو اونچی عمارت بننا ہی نہیں چاہئے۔ ایسے خطّے میں شہر کو پھیلا دینا چاہئے عمارتوں کو یک منزلہ یا دو منزلہ رکھ کر اور کشادہ اور

مضبوط سڑکوں کا جال بچھا کر۔

''تو کیا کم زلزلے والے علاقے میں ملٹی اسٹوری بلڈنگ، بنائی جاسکتی ہے؟''
سلوچنا نے شروع شروع میں اس سے سوال کیا تھا۔

''ہاں مناسب اونچائی تک بنائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد کو عمارت کی اونچائی کا خیال کرتے ہوئے اور زمین کے اندر کی مٹی کی خصوصیات کے حساب سے مناسب گہرائی تک لے جانا ہوگا ___ یوں سمجھو، ایک ریل گاڑی میں ایک مسافر اگر کھڑا ہوکر سفر کررہا ہے تو اس کا جسم ہچکولے کھا رہا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی وہ کھڑا رہتا ہے۔ گرتا نہیں ___ کیونکہ اس کی ٹانگیں، اس کے توازن کو برقرار رکھتی ہیں اور ہاتھ کسی چیز کا سہارا لے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک اونچی عمارت کی بنیاد اگر گہری اور مضبوط ہے اور زمین کے اندر سے اوپر تک اٹھائے گئے کالم بھی مضبوط ہیں تو وہ زلزلے کے ہچکولوں میں بھی کھڑی رہ سکتی ہے۔ عمارت کی گہری بنیاد کو اس کی ٹانگیں سمجھ لو اور کالم کو سہارا ___ یعنی کم زلزلے والے علاقے میں مضبوط بنیاد والی عمارت زمین کے ساتھ ہلے گی، گرے گی نہیں۔ اسٹرکچرل انجینئرنگ میں تو ایسی ریسرچ کی ضرورت ہے کہ زلزلے کی وجہ سے آنے والے ہچکولوں کو جذب کرنے کے لیے عمارت میں کس طرح کا اور کہاں پر مناسب سامان لگایا جائے اور کیسی ٹیکنک استعمال کی جائے''۔

انجینئرنگ کے انہی اصولوں کی وجہ سے ان کی کنسل ٹینسی کافی چل نکلی تھی۔ جہاں تک فرم میں ان دونوں کے کام کا سوال تھا تو سلوچنا ہر کام میں سری نواس کی معتقد تھی۔ بلکہ وہ اپنے شعبے آرکیٹکچر میں بھی سری نواس سے مشورہ کرلیا کرتی تھی۔ فرم کے کسی کام کے بارے میں دونوں میں کبھی بحث نہ ہوتی۔ فرم میں تو جیسے وہ سری نواس کو اپنا باس مانتی تھی۔ باس سے بحث کیسی؟

سری نواس کے اچانک گھر سے غائب ہو جانے کے بعد سلوچنا پاریکھ کنسل ٹینسی کے کام کو نہ چلا سکی۔ اس کا آرکی ٹیکچر کا کام بھی ڈھیلا پڑ گیا۔

سری نواس کے گھر سے چلے جانے کے بعد کچھ روز تو وہ اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے شہر میں اور شہر کے باہر تمام رشتہ داروں اور دوستوں سے اس کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ اخباروں اور ٹی وی میں اشتہار دیئے لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے ماں باپ، اس کے ساس سسر، اس کے تمام رشتہ دار اور عزیز یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ سری نواس اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن سلوچنا یہ ماننے کو ہرگز تیار نہ تھی۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ بچوں کو ان کے دادا دادی کے حوالے کر کے، سری نواس کی تصویر لے کر خود اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ـــــ وہ پاگلوں کی طرح شہر شہر گھومتی پھری۔ سول انجینئر نگ کے مختلف اداروں میں، ٹیکنیکل کتابوں کے بک اسٹالوں پر، اونچی عمارتیں بنانے والے بلڈر کے پاس، سری نواس کی تصویر دکھا کر پوچھتی۔

''بھائی صاحب! آپ نے ان کو کہیں دیکھا ہے؟ یہ میرے پتی سری نواس پاریکھ کی تصویر ہے۔ یہ سول انجینئر ہیں۔ ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے ڈیزائن کے ماہر ـــــ ہوسکتا ہے بھائی صاحب کہ آپ کی طرح کسی بلڈر کے پاس ملازمت کر رہے ہوں، یا ان کا سول انجینئر نگ کا کوئی کام کیا ہو؟!''

''نہیں بھائی صاحب ـــــ! یہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی تو نہیں کر سکتے ـــــ اس کا مجھے پکّا یقین ہے۔ بس مجھ سے روٹھ کر چلے گئے ہیں مل جائیں گے ـــــ تو میں منا لوں گی''۔

وہ گجرات کے تقریباً ہر شہر میں گئی۔ لیکن بھُج نہیں گئی۔ اور سری نواس بھُج میں تھا۔ وہ کئی شہروں میں ایک ایک دو دو مہینے گھومتے رہنے کے بعد اب بھج میں رہائش پذیر تھا۔ اور اپنا خود کا بلڈنگ ڈیزائن کا کام کر رہا تھا ـــــ وہ سلوچنا کے بارے میں سوچتا ضرور تھا۔

اس کی آرکی ٹیکچرل مہارت کے بارے میں اور اس کے اپنے تعلق کے بارے میں۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے بارے میں بھی سوچتا۔ ان کی تعلیم کے بارے میں، ان کی پرورش کے بارے میں، ان کی شرارتوں کے بارے میں۔ بیٹیوں کے بارے میں سوچتا تو اسے سلوچنا کی یاد آجاتی اور سلوچنا کے بارے میں سوچتا تو اسے بیٹیاں یاد آنے لگتیں____ لیکن اس نے کبھی ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے یا سلوچنا کو ٹیلی فون کرنے یا خط لکھنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

پھر یہ بھونچال آگیا____ اور اس بھونچال نے بھج کو تباہ و برباد کردیا____ صرف چند عمارتیں بچ گئیں____ اس کی ڈیزائن کی ہوئی تو کوئی بھی عمارت نہیں گری۔ وہ خود بھی بچ گیا، کیونکہ اس وقت وہ ایک کھلی جگہ پر کھڑا تھا۔ ایک بلڈر کے لیے عمارت بنانے کے سلسلے میں اس عمارت کی جگہ پر، ہاتھ میں عمارت کا نقشہ لیے۔ اس جگہ کا سروے کرواتا ہوا۔

دوسرے دن شام کو سری نواس نے ٹیلی ویژن پر احمد آباد کی تباہ شدہ عمارتوں کو دیکھا۔ اس اسکول کو دیکھا جس میں چالیس بچے ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی بڑی بیٹی کو اسی اسکول کے نرسری سیکشن میں داخل کرایا تھا____ کیا پتہ اس کی بیٹی اس وقت بھی اسی اسکول کی طالبہ ہو؟ اور اس کی بیوی سلوچنا نے چھوٹی بیٹی کو بھی اسی اسکول میں داخل کرادیا ہو____؟ یہ سوچ کر وہ تڑپ اٹھا۔

احمد آباد میں جب زلزلہ آیا تو اس سے دو سال قبل سلوچنا اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک دوسرے اسکول میں داخل کرا چکی تھی اور زلزلے کے وقت وہ دونوں اپنے اسکول میں تھیں اور سلوچنا گھر پر تھی۔ تیسری منزل پر بنے اپنے فلیٹ میں وہ کچن میں کام کر رہی تھی۔ اچانک اس نے کچن کی کھڑکیوں کو ہلتے دیکھا اور خود بھی جھٹکے محسوس کیے۔ سامنے والی چھ منزل عمارت نیچے دھنس گئی تھی اور اس کی چوتھی منزل اس کی اپنی عمارت کی تیسری

منزل کے سامنے آ گئی تھی۔ پھر زور کی گڑ گڑاہٹ ہوئی اور اس عمارت کے دو حصے ہو گئے اور پھر ایک حصہ دھڑ دھڑ کرتا گر گیا۔ اور یہ سب چند سکنڈ میں ہو گیا۔ اور اب اس کی اپنی بلڈنگ کے لوگوں کے سیڑھیوں کی طرف بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''بھونچال !___ بھونچال آ گیا___ بھوکمپ___ باہر نکل آ ؤ___ نیچے کھلی جگہ پر___ جلدی جلدی___''

سیڑھیوں پر لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے اتر رہے تھے___ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کب ان میں شامل ہو گئی___ اور کب دھکے کھاتی سیڑھیاں پھلانگتی ان سب کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ اور اب وہ سب لوگ کالونی کے پارک میں جمع تھے۔

مسز پاریکھ! یہ سامنے والی بلڈنگ کو کیا ہوا___ ؟ گراؤنڈ فلور تو اندر دھنس گیا؟''

''ہاں۔ اس کی بنیاد کے نیچے اس کے تاثراتی حصے میں ضرور کوئی کم کثیف اور بھربھری تہ رہی ہو گی جس کی وجہ سے بلڈنگ دھنس گئی اور غیر متوازن دھنسنے کی وجہ سے ایک حصہ کٹ کر گر گیا۔ میرے شوہر سری نواس کہا کرتے ہیں___ ''زلزلہ جان لیوا نہیں ہوتا۔ غلط بنائی گئی عمارت ضرورت جان لیوا ہوتی ہے۔''

اور اس وقت اسے اچانک دھیان آ گیا سری نواس کا۔ پورے چھ برس ہو گئے تھے اس کو گھر سے گئے ہوئے۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب اس نے سری نواس کو یاد نہ کیا ہو۔ ان دونوں کی اکٹھی کھنچی ہوئی تصویر فریم میں جڑی اس کے بیڈ کے پاس میز پر رکھی تھی اور ہر روز اسے دکھائی دیتی تھی۔ آس پاس کے سب لوگ اسے بھول چکے تھے۔ وہی لوگ جنھوں نے پہلے کے چند مہینوں میں سب سے باتیں کی تھیں۔ ان دونوں کے بارے میں، اور دبے الفاظ میں اسے ہی قصوروار ٹھہرایا تھا۔

''بھئی ان دونوں کی گرما گرم بحث تو ہم نے اکثر سنی تھی___ بارہ بجے رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ان کے اونچی آوازیں___ اف؟'' ساتھ والے فلیٹ کی مسز دھیرو

بھائی نے اپنی دوسری پڑوسن مسز مدلیار سے سلوچنا کو سنانے کے لیے ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔اور مسز مدلیار نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اس گرم بحث کے بعد دونوں کو نیند کہاں آتی ہوگی۔۔۔۔۔۔دونوں ہی تناؤ میں رہتے ہوں گے ساری رات۔''

اوراب۔۔۔۔۔۔اب وہ لوگ سری نواس کو بھول چکے تھے۔

سلوچنا کی عمارت میں ایک بہت بڑی درار آگئی تھی۔لگتا تھا۔معمولی سا جھٹکا بھی عمارت کو گرانے کے لیے کافی ہوگا۔ایسے حالات میں عمارت سے نکلے ہوئے افراد واپس اپنے گھروں میں جانے کے لیے تیار نہ تھے۔اسی طرح شہر بھر کی خطرناک عمارتوں کے لوگ باہر کھلے میدانوں میں لگے خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ان میں تباہ شدہ عمارتوں کے لوگ بھی شامل تھے۔کئی خاندان کے آدھے سے زیادہ افراد ملبے میں دبے پڑے تھے۔ان کو ملبے سے نکالنے کا کام اور زلزلے سے متاثر لوگوں کی ضروریات جٹانے کا کام جاری تھا۔اپنے ملک سے ہی نہیں،دوسرے ممالک سے بھی مدد پہنچنے لگی تھی۔

کالونی کے پاس والے میدان میں بے شمار چھوٹے بڑے خیمے۔اوران خیموں میں رہنے والے دودو،تین تین،چار چار افراد پر مشتمل خاندان۔انہی خیموں میں سے ایک خیمہ میں سلوچنا بھی رہ رہی تھی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ۔کبھی کسی خیمے سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگتیں جب اس میں رہنے والے خاندان کے کسی فرد کی لاش ملبے سے نکالی جاتی۔اس خاندان کے دکھ درد سے آس پاس کے سب لوگ متاثر ہوتے۔

لیکن۔پچھلے دو دن سے سلوچنا ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو رہی تھی۔بلکہ اس کے چہرے سے تو خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔اگر اس کے چہرے پر دکھ ابھرتا بھی تو صاف نظر آتا کہ وہ دکھ بناوٹی ہے۔ایک دکھاوے کا دکھ ہے۔

آس پاس کے خیموں میں رہنے والے بہت سے لوگ اس کے اس رویے کی وجہ نہیں جانتے ۔ وہ اس کی خوشی کو، اس کی مسکراہٹ کو ایک اذیت پسند کی خوشی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ دوسروں کو دکھ میں دیکھ کر خوش ہونے والا شخص !

لیکن سلوچنا___ ؟؟ وہ ان سب کو کیسے بتائے کہ اس زلزلے نے اس کے شوہر کو اس سے ملا دیا ہے۔ دو ہی دن پہلے اس کا شوہر گھر واپس آ گیا ہے۔ بھلے ہی اس کو اس کی بیٹیوں کی محبت گھر واپس لائی ہو!

اے۔بی۔سی۔ڈی

جب میں سات برس کی تھی تو مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میرے ممی پاپا امریکہ کے نہیں ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔لیکن اس وقت میں ہندوستان کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا کہ ایک سات آٹھ برس کا بچہ جان سکتا ہے۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔امریکہ سے بہت دور ہے۔ ہندوستان میں پہلے راجے مہاراجے اور بادشاہ ہوتے تھے۔پھر انگریزوں کی حکومت آگئی۔پھر انگریز چلے گئے۔اب ہندوستان میں ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہے۔اس وقت میں یہ بھی سوچا کرتی کہ جب ہمارا ملک ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے،سارے جہاں سے اچھا ہےتو پھر میرے ممی پاپا اپنا ملک چھوڑ کر یہاں امریکہ میں آکر کیوں بس گئے،کسی دوسرے ملک میں ملازمت کرنا تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن وہاں جا کر بس جانا؟!میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

میرے پاپا امریکہ میں کسی کمپنی میں ملازم تھے جب اُن کی شادی میری ممی کے ساتھ ہوئی۔شادی کے بعد ممی بھی ان کے ساتھ امریکہ آگئیں۔اور میری پیدائش امریکہ میں ہوئی اور اس کے بعد میرے ممی پاپا نے امریکہ میں سکونت اختیار کرلی۔اپنے ماں باپ یعنی میری دادا دادی، نانا نانی،اور سب عزیزوں رشتے داروں سے دور بہت دور۔ اتنی دور کہ جہاں سے ہندوستان آنے کے لیے سترہ اٹھارہ گھنٹے کا تو صرف ہوائی جہاز کا

ہی سفر ہے!

میری پیدائش کے چار ماہ بعد میرے دادا دادی نے میرے ممی پاپا پر ٹیلی فون کے ذریعہ دباؤ ڈال کر انھیں میرے ''نام کرن سنسکار'' کی تقریب ہندوستان اپنے گھر میں آکر منانے کے لیے راضی کرلیا اور میرے ممی پاپا مجھے لے کر کچھ دنوں کے لیے ہندوستان آگئے۔ میرا نام ''بھارتی'' ہمارے گھر کے رسم ورواج کے مطابق میرے دادا ہی نے رکھا تھا۔

ہندوستان کی میری دوسری یاترا جب ہوئی جب میں سات برس کی تھی۔ اس سے پہلے جب میں تین برس کی تھی تو پاپا نے دادا دادی کو امریکہ آنے جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھجوا کر امریکہ بلوایا تھا۔ اور وہ لوگ تین ماہ یہاں ہمارے پاس رہے تھے۔ اور اس کے بعد میرے نانا نانی بھی دو ماہ کے لیے یہاں امریکہ میں ہمارے پاس رہ کر گئے تھے۔ یعنی ممی کی ملاقات اپنے والدین سے ہوگئی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب یہ لوگ واپس گئے تھے تو میں بہت روئی تھی اور میں نے دیکھا کہ وہ لوگ بھی بار بار اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔ وہ لوگ خشک آنکھوں سے بھی رونا جانتے تھے۔ اور اس کے بعد تو اکیلے پاپا ہی دوبار، پندرہ پندرہ دن کے لیے ہندوستان گئے۔ ہاں ٹیلی فون پر ضرور تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ان سب سے بات چیت ہوتی رہی۔ اور پھر دونوں طرف سے انٹرنیٹ ویب کیمرہ فون، کے ذریعے بات ہونے لگی جہاں ہم سب کمپیوٹر پر ایک دوسرے کی شکلیں، ایک دوسرے کے گھر کے کمرے اور رہن سہن بھی دیکھنے لگے۔

امریکہ میں ہم نیویارک میں رہتے ہیں۔ پاپا نے یہاں اپنا فلیٹ خرید لیا ہے۔ ہمارے پڑوس میں پاکستان سے آئے ہوئے اسلم انکل رہتے ہیں۔ وہ لوگ میرے ممی پاپا سے بھی پہلے امریکہ میں آبسے تھے۔ ان کی بیٹی رضیہ میری ہم عمر ہے اور میری کلاس فیلو ہے ہمارے دونوں گھروں میں بہت دوستی ہے۔ تقریباً ہر روز ایک دوسرے کے یہاں آنا

جاتا ہے۔ میرا اور رضیہ کا پیار تو سگی بہنوں جیسا ہے۔

اسکول میں کرسمس ایو کا فنکشن تھا طلباء کو اسٹیج پر ناچ گانے اور مختلف قسم کے پروگرام پیش کرنا تھے۔ ہماری ایک امریکن کلاس فیلو کا بڑا بھائی جو ٹیکساس میں کسی انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا۔ چھٹی میں گھر آیا ہوا تھا۔ ہمارے اسکول کے کرسمس کے فنکشن میں بھی آیا۔ ہماری دوست نے اس سے ہم دونوں کا تعارف کرایا تو وہ ذرا مسکراتے ہوئے ذرا ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔

''او ـــــ تو یہ دونوں بھی 'اے بی سی ڈی' ہیں؟''

میری دوست ہنس دی اور ساتھ میں ہم دونوں بھی ہنس دیے۔

لیکن میرے من میں کچھ کھٹک سا گیا۔

'اے۔بی۔سی۔ڈی'؟ اس نے ہمیں ''اے۔بی۔سی۔ڈی کیوں کہا؟ انگریزی کے ان پہلے چار حروف کا لیبل ہم پر کیوں لگا دیا پھر جلد ہی ہم دونوں کو پتہ چل گیا ''اے، بی، سی، ڈی'' سے اس کا مطلب تھا ''امریکن بارن کنفیوزڈ دیسی'' یعنی امریکہ میں پیدا ہوئے ''الجھنوں میں گرفتار دیسی'' یعنی میں اور رضیہ دونوں الجھنوں میں گرفتار بچے ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کی پہچان کیا ہے؟ دیسی یعنی ہندوستانی یا پاکستانی والدین کی امریکہ میں پیدا ہوئی اولاد!

شروع میں تو ہم نے اس نئے دریافت ہوئی اصطلاح کی کچھ خاص پروانہ کی اور نہ ہی اس کے پیچھے چھپی تضحیک کی ـــــ پروا کرنے یا برا ماننے کے لیے ابھی ہم بچے ہی تھے دس گیارہ برس کے بچے ـــــ! برا ماننے کا بھی ہم میں شعور نہ تھا۔

لیکن اب ـــــ اب تو ہم ہائی اسکول کے طالب علم ہیں۔ سب سمجھتے ہیں۔ اب دل پر چوٹ لگتی ہے ایسی باتوں سے۔

ہماری کلاس کے کچھ طلباء امریکی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب کے بارے میں

بحث مباحثہ کرر ہے تھے۔میں نے اپنا نظریہ پیش کرنا چاہا تو ایک امریکی کلاس فیلو کے یوں کہنے پر ''تم چپ رہو یار تم ایک اے۔بی۔سی۔ڈی ہو'' میرے من پر گہری چوٹ لگی یہ ہمیں ایسا کیوں کہتے ہیں؟

پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ تقریباً ہر سنئیر اسکول میں ہندوستان یا پاکستان سے آکر امریکہ میں بس جانے والے والدین کی اولاد ''اے۔بی۔سی۔ڈی'' کہلاتی ہے اور وہ خود بھی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہے۔گھر میں اپنے ملک کا ماحول اور کالج میں امریکی ماحول!

جب میں بزنس مینجمنٹ کورس کرنے کے لیے نیویارک کی یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہاں طلباء تین گروپوں میں بٹ گئے ہیں۔اے۔بی۔سی۔ڈی طالب علم، خالص امریکی طالب علم، اور وہ طالب علم جو ہندوستان یا پاکستان سے صرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔یعنی جن کے والدین ان کے اپنے ملک میں رہتے ہیں۔خالص امریکی طالب علم اپنے آپ کو دوسرے سب طالب علموں سے برتر سمجھتے ہیں اور ہم اے۔بی۔سی۔ڈی طالب علم اپنے آپ کو ان طلباء سے جو صرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں کبھی تو برتر سمجھتے ہیں (آخر ہم امریکہ کی پیداوار تو ہیں ہی) اور کبھی ان سے کم تر سمجھنے لگتے ہیں۔وہ ہمارے مذہب ہماری تہذیب اور ہمارے تہواروں میں پلے بڑھے ہیں۔اس لحاظ سے وہ ہم سے بہتر ہیں۔

امریکہ میں بس جانے کے بعد میرے اور رضیہ کے والدین کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہم اپنی تہذیب اور وراثت سے دور نہ ہوں اس لیے جب ہمارا شعور کچھ پختہ ہوا تو انھوں نے ہمیں ''سنڈے ہندی اردو اسکول'' میں داخل کروا دیا جہاں ہم ان دونوں زبانوں کو سیکھنے کے علاوہ ان زبانوں کے ذریعہ اپنے مذہب اور تہذیب کی جانکاری حاصل کرتے۔ یہ اسکول صرف دو گھنٹے کا اسکول تھا۔شروع شروع میں تو سنڈے یعنی چھٹی کے دن یہ دو گھنٹے اسکول میں گزارنا کھل جاتا لیکن پھر سنڈے کی یہ دوڑ ہمارا معمول بن

گئی۔اس کے علاوہ ہم نے ہمارے گھر پر ایک ٹیوٹر سے ہندوستانی ساز وسنگیت سیکھنا بھی شروع کر دیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم اپنے تہواروں ہولی، دیوالی ،عید، میں اپنے اس علم وفن کا استعمال کرنے لگے۔امریکن شہری ہوجانے کے ناطے کرسمس تو ہم مناتے ہی تھے اب اپنے محدود دائرے میں یعنی اپنے دو چار ہم وطنوں کے ساتھ مل کر اپنے تہوار بھی اپنے ملک کے رنگ ڈھنگ سے منانے لگے۔شروع میں ہم کرسمس کے دن اپنے گھروں میں کرسمس ٹری (کرسمس کا درخت) سجانے کے علاوہ دوستوں اور پڑوسیوں کے یہاں ''ہپی کرسمس'' کہنے کے لیے تو ضرور جاتے تھے لیکن رات کو اپنے گھروں میں روشنیاں نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں یہ محسوس کیا کہ آس پاس کے سب گھروں میں روشنیاں ہوتے ہوئے ہمارے دو گھر اندھیرے میں کیوں ڈوبے رہیں۔ہم نے بھی کرسمس کے دن اپنے گھروں میں بجلی کے قمقمے لگانا شروع کر دیے۔دیوالی، ہولی اور عید ہم کچھ حد تک ہی مناپاتے کیوں کہ اس شہر میں ہمارے ہم وطن ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر رہتے تھے کہیں کہیں کسی مندر یا مسجد کے پاس کسی کھلی جگہ پر اکٹھے ہوجاتے اور آپس میں ملن ہوجاتا۔دیوالی کے بارے میں میرا تصوّر تھا۔ڈھیر ساری موم بتیاں جلائی جائیں، گھروں کو اور عمارتوں کو رنگ برنگے بجلی کے قمقموں سے سجایا جائے۔آتش بازی چھوڑی جائے۔ دیر رات تک پٹاخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ہوا میں ہلکی ہلکی گندھک کی بو پھیلی ہو اور گھروں میں طرح طرح کی مٹھائیاں آئیں اور ہولی کے بارے میں سوچتی تھی کہ ہولی رنگوں کا تہوار ہے۔کپڑوں پر گیلا رنگ چہروں پر کہیں سوکھا گلال تو کہیں تھوڑا سا پانی ملا رنگ پتا ہوا اور فضا میں اڑتا رنگا رنگ کا گلال۔ایک دوسرے پر رنگ ڈالنا اور آپس میں گلے ملنا۔دوستوں ،پڑوسیوں، رشتے داروں کے گھروں میں جا کر کئی کئی دن تک ہولی ملن۔گھروں میں بنتے طرح طرح کے پکوان جن میں گجیا سب سے پردھان!اور اسی طرح عید کے بارے میں بھی۔سفید براق، نئے یا شفاف دھلے کپڑوں میں ملبوس، سروں

پر از راہ احترام سفید ٹوپیاں، اور پھر رات گئے تک ایک دوسرے کے یہاں جا کر عید ملن اور طرح طرح سے پکائی سوَئیوں سے مہمانوں کی ضیافت! یہ سب تصوّرات ہم اے۔بی۔سی۔ڈی طلباء نے اپنے والدین یا ہندوستان سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے طلباء سے یا ان کے ذریعہ ویڈیو کیمرہ سے کھینچی فلم دیکھنے کے بعد قائم کیے تھے ورنہ اپنے دیس میں جا کر ان تہواروں کو منانا ہم میں سے کسی کے نصیب میں نہ تھا۔ میرے اور رضیہ کے نصیب میں تو قطعی نہ تھا۔

میں اور رضیہ دونوں اپنے اپنے والدین کے ساتھ باقاعدہ مندر مسجد جاتے تھے اور اتنی باقاعدگی کے ساتھ جاتے کہ جتنا ہندوستان یا پاکستان کے بچے بھی نہ جاتے ہوں گے! میرا ایک سکھ کلاس فیلو اے۔بی۔سی۔ڈی اجیت سنگھ بھی تھا جو اپنے والدین کے ساتھ باقاعدہ گورودوارہ جاتا تھا۔

اپنے ملک کے سیاسی حالات سے باخبر رہنے کے لیے ہمارے گھروں میں ایسے اخبار بھی آتے جن میں ہندوستان اور پاکستان کی خبریں بکثرت ہوتیں۔ کبھی تازہ اور کبھی باسی۔

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے کہ جس کو دیکھنے کے شوقین ہندوستان و پاکستان میں سب سے زیادہ ہیں اور امریکہ میں سب سے کم۔ ہم اے۔بی۔سی۔ڈی طلباء امریکن ماحول میں بڑھنے پھولنے کی وجہ سے کرکٹ کے کھیل میں کم ہی دلچسپی رکھتے تھے جب کہ ہمارے والدین اور ہمارے ہندوستانی یا پاکستانی ساتھی وقت ملنے پر ضرور ٹی وی لگا لیتے۔ امریکہ کی مصروف زندگی میں وقت انھیں بھی کم ہی ملتا۔ اور ہم محسوس کرتے کہ کرکٹ میچ نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے وہ دکھی ہو اٹھتے۔

اب آپ ہی بتائیے یہ سب باتیں، یہ سب حالات، یہ سب تصوّرات، ہمیں الجھن میں ڈالنے کے لیے کافی تھے یا نہیں؟ ہم امریکن ہو گئے ہیں یا ابھی ہم ہندوستانی یا پاکستانی ہیں؟ ہم سچ مچ اے۔بی۔سی۔ڈی۔ ہیں۔ دیسی والدین کی امریکن اولاد!

ہماری یہ الجھن اس وقت بھی برقرار تھی۔ جب ہم اپنی ٹیکنیکل تعلیم پوری کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش میں جٹے تھے۔ اور ہر روز اخبار میں اور انٹرنیٹ پر ''ضرورت ہے'' کا اشتہار دیکھ رہے تھے۔

ایک روز رضیہ اپنا اخبار پکڑے میرے پاس آئی۔ وہ بہت جوش میں تھی۔

''یہ خبر پڑھی تم نے؟''

''ہندوستان کی آئی۔ آئی۔ ایم کی ٹاپر لڑکی کو ایک امریکن کمپنی نے اپنے امریکہ کے دفتر کے لیے پانچ ہزار ڈالر ماہوار تنخواہ کی ملازمت آفر کی ہے۔ یعنی ہندوستان کرنسی میں تقریباً سوا دو لاکھ روپے ماہوار۔''

''واوو (ارے واہ)''

''آگے بھی تو سنو ـــــ'' اس لڑکی نے یہ آفر ٹھکرا دی ہے کہتی ہے وہ اپنا دیس چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ وہ ہندوستان ہی میں ملازمت کرے گی۔ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ وہ کوشش کرے گی کہ وہ ملازم نہ بن کر ملازم رکھنے والی بنے یعنی کوئی اپنی کمپنی کھول لے گی۔''

''گڈ ـــــ ریئلی گڈ!''

اور میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ اور خود وہ خبر پڑھنے لگی۔

''میں آج بھی ''اے۔ بی۔ سی۔ ڈی'' ہی ہوں۔ ٹھہریے! بتاتی ہوں۔''

ایک امریکن کمپنی کے ہندوستان کے دفتر میں ملازمت مل جانے پر میں نے اپنے والدین کو راضی کر لیا کہ میں ہندوستان میں جا کر ملازمت کروں گی۔ اور جب میں نے ہندوستان میں ملازمت جوائن کر لی تو پہلی تنخواہ ملنے پر میں نے یہاں ایک مکان بھی بک کروا دیا۔ جی ہاں۔ اب میں یہیں ہندوستان میں رہوں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

میں آج بھی اے۔ بی۔ سی۔ ڈی ہوں لیکن امریکن بارن کنفیوزڈ دیسی نہیں۔

امریکن بارن کنفرمڈ دیسی ''یعنی امریکہ میں پیدا ہوئی پکی ہندوستانی!

دہشت گرد

''یہ لڑکی جتنا کام کر سکتی تھی، کر چکی ـــــ ہمارے لیے ہی نہیں، اپنے ساتھیوں کے لیے بھی کر چکی۔ اب اس کا خاتمہ یقینی ہے ہمارے ہاتھوں ہو، چاہے اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں بہتر یہی ہوگا کہ تم اسے ختم کر دو۔''

''سر کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ختم کر دوں؟ یعنی...... میں اسے ختم کر دوں؟''

''ہاں تم اسے ختم کر دو۔ اگر تم نے اسے ختم نہ کیا تو اس کے اپنے ساتھی اسے ختم کر دیں گے۔ اسے اب مرنا ہی ہے۔ ایک دہشت گرد کا انجام ہمیشہ ایک غیر قدرتی موت ہوتا ہے اور یہ لڑکی ''ڈبل گیم'' کھیل رہی ہے۔ اگر ہماری مدد کر رہی ہے تو ہمیں نقصان بھی پہنچا رہی ہے اور ہم نقصان نہیں برداشت کر سکتے تم اسے ختم کر دو۔ یہ میرا آرڈر ہے۔!''

''یس سر۔'' میجر نے اپنے باس کو سیلیوٹ کیا اور پھر سر جھکائے چل دیا۔

وہ لڑکی جہاد کے نام پر دہشت گردوں کے گروپ میں شامل ہوگئی تھی بلکہ ان دہشت گردوں کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ ایک بائیس سالہ خوبصورت معصوم لڑکی! جس کا بڑا بھائی ماں باپ کے سمجھانے کے باوجود ایک دہشت گرد بن گیا تھا۔ اور تھوڑے ہی دن پہلے اپنے دو ساتھیوں سمیت ملٹری کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر اس کے

پارٹی والے اس کی بہن کو یعنی اس لڑکی کو اپنے گروپ میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

''تمہیں اپنے بھائی کا بدلہ لینا ہے۔تمہارا بھائی دشمن کی گولی سے شہید ہوا ہے۔اس کی روح کو جب ہی سکون ملے گا۔جب تم دشمن کے سینکڑوں آدمیوں کا خاتمہ کردو گی۔''

اور وہ تیار ہوگئی تھی۔

جہاں تک اس کے بھائی کا تعلق ہے تو وہ ایک عرصہ سے بیکاری جھیلنے کے بعد ہر ماہ ایک موٹی رقم پانے کے لالچ میں دہشت گردوں سے آملا تھا۔

''اس ماہانہ خرچ کے علاوہ تمہیں تمہاری فوری ضرورتوں کے لیے بھی مدد دی جائے گی جیسے تمہاری بہن کی شادی کے لیے۔اور اگر دشمن کی گولی سے شہید ہوگئے تو جنت میں جگہ ملے گی۔یعنی زندگی اور موت دونوں میں عیش!''

اور یہ بہت کافی تھا ایک بیکار انسان کو دہشت گرد بنانے کے لیے۔

اور اب اس کی موت کے بعد دہشت گرد اس کی جوان بہن کی خوبصورتی کا فائدہ اٹھانا چاہئے تھے! اسے چھ ماہ کی سخت ٹریننگ دی گئی۔اور اس ٹریننگ میں شامل تھا۔ بندوق اور پستول چلانا، چھپ کروار کرنا، ہر قسم کی جسمانی اذیت برداشت کرنا، ہلکی مشین گن، بھاری مشین گن، اے۔کے۔47اور ایکس پلوسیو (Explosive) کا استعمال یعنی بم بلاسٹ کی ٹریننگ۔

''اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمہارا اور صرف تمہارا مذہب ہی صحیح اور سچا مذہب ہے۔دوسرے سب مذہب غلط اور جھوٹے ہیں۔اور ان کے ماننے والے سب کافر ہیں۔'' دوسرے دھرموں کے بارے میں کچھ بھی جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہ جان سکی کہ درحقیقت سب دھرم ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں اور سب دھرم شاستروں میں ایک ہی سچائی کا سبق ملتا ہے۔''

اس کے ذمے سب سے ضروری کام دشمن کے کسی افسر سے دوستی بنا کر، اسے اپنی طرف راغب کر کے اور محبت کا ڈھونگ رچا کر دشمن کی اسکیموں کے بارے میں پتہ لگانا تھا اور وہ اپنی پہلی ہی کوشش میں ایک افسر سے دوستی بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں جہاں کئی فوجی افسر سویلین یعنی غیر فوجی پوشاک میں کھانے پینے کے لیے آتے تھے، وہ میجر کنور سے ملی تھی۔ وہ حیران ہوئی کہ یہ میجر پہلی ہی ملاقات میں اس کی طرف راغب ہو گیا تھا! اسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا۔

جب ایک دوسرے کے ناموں سے متعارف ہوئے تو اس نے اپنا اصل نام نہ بتا کر خود کو ''شبنم'' کہہ کر متعارف کروایا میجر کا نام کنور ہی اس کا اصل نام تھا۔ یہ وہ جان گئی تھی کیوں کہ ایک ساتھی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

چائے ناشتہ کے بعد میجر اسے پاس میں بنے ایک مندر میں لے گیا میجر کو مندر میں جاتے دیکھ وہ بالکل حیران نہیں ہوئی کیوں کہ اس نے اکثر فوجیوں کو پاس پاس بنے مندر، مسجد، گورودوارے اور چرچ میں جاتے دیکھا تھا۔ اور وہ جان گئی تھی کہ یہ سب فوجی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق ''دعا'' میں یقین رکھتے ہوئے بھی دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ فوجیوں کی یہ بات اسے دلوں کو جوڑنے کا کردار نبھانا لگی۔ اور پل بھر کے لیے اس کا دل دہشت گردی سے ہٹ گیا۔ لیکن اسے تو اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینا ہے اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ دو ہی چار ملاقاتوں میں وہ سچ مچ میجر کنور سے محبت کرنے لگی! وہ اپنے دل سے ہار گئی۔ اس کے دل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کنور کو سب کچھ بتا دے۔ اور اس نے اپنا اصل نام اور اپنا دہشت گرد ہونا سب بتا دیا اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ دہشت گردی چھوڑنا چاہتی ہے۔

''کنور مجھے اپنا لو مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو، کسی محفوظ جگہ پر۔ میں دہشت گردی ترک کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ جب ہی ممکن ہے جب تم میری حفاظت کا ذمہ لے لو

یہ سمجھ لو کہ اگر دہشت گرد بننا خطرناک ہے تو دہشت گرد بن جانے کے بعد دہشت گردی چھوڑنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ مجھے میرے ساتھی یقیناً ختم کر دیں گے اور...... اور میں مرنا نہیں چاہتی۔''

کنور خاموش رہا۔ کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھنے لگا جیسے اس کے جملوں کی سچائی جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے غلط فہمی میں رکھنا ٹھیک رہے گا۔ اس لڑکی سے بہت کام لیا جا سکتا ہے، کنور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہلکے سے دبا دیا۔

''مجھے کچھ وقت دو سوچنے کے لیے چلو۔ چائے پیتے ہیں۔''

اور وہ اسے لے کر اس ریسٹورینٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

''نہیں۔ آج وہاں نہیں۔ آج کہیں اور چلتے ہیں۔'' اور دونوں ریسٹورنٹ سے کچھ فاصلے پر بنے ایک ڈھابے کی طرف بڑھ گئے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کے پیچھے ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ ایک ملبے میں تبدیل ہو گیا۔

اتفاق کی بات ریسٹورنٹ بالکل خالی تھا۔ صرف کچن میں کام کرنے والے دو شخص تھے وہاں اس وقت۔ وہ وہ دونوں بھی فوجی جوانوں کے ساتھ ملبہ ہٹانے اور اس کے نیچے سے ان دو زخمیوں کو نکالنے میں لگے تھے تو میجر کنور سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی نے اسی ریسٹورنٹ میں جانے کے لیے منع کیوں کیا؟

''تو تمہیں پتہ تھا کہ یہاں بم بلاسٹ ہوگا'' اس نے بے جھجک اس سے سیدھی بات کی۔

''ہاں۔ یہ تو مجھے پتہ چل گیا تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ بلاسٹ کس وقت ہوگا۔ اتفاق کی بات کہ آج اسی وقت ہو گیا۔ شکر ہے کہ میں نے تمہیں بچا لیا۔''

کنور نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر تیز نگاہ ڈالی۔ ''تو کتنا سچ بول رہی ہے۔ کتنا جھوٹ؟''

لیکن اس نے اس لڑکی سے کچھ نہیں کہا، بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔
میجر نے اسی روز اپنے باس کو اس کی اصلیت کے بارے میں بتادیا۔اور یہ بھی بتادیا کہ وہ لڑکی اس کو چاہنے لگی ہے۔
اور اسی طرح وہ میجر کنور کی مدد بھی کرتی رہی اور اپنے ساتھیوں کو بھی ضروری اطلاعات بہم پہنچاتی رہی۔میجر اپنے جوانوں کے ساتھ کئی تشدد پسندوں کا صفایا بھی کرتا رہا اور اس لڑکی کی مدد سے کئی جگہ بم بلاسٹ بھی ہوتے رہے اور جب ایک آرمی کنوائے پر بھی حملہ ہو گیا تو میجر کو اس لڑکی کو ختم کردینے کا حکم مل گیا۔
میجر اپنے باس کی اس بات سے تو اتفاق کرتا تھا کہ یہ لڑکی اگر ان کی مدد کر رہی ہے تو ان کو نقصان بھی پہنچا رہی ہے لیکن اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اسے گولی سے اڑا دے بھلے ہی وہ اسے اپنانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ اس کے حسن سے تو متاثر تھا ہی۔کیا پتہ جب وہ اسے اس دہشت گردی کے ماحول سے دور لے جائے تو وہ خود بھی اسے چاہنے لگے۔دل کے کسی کونے میں وہ اس کے لیے چاہ بھی محسوس کرتا تھا۔ایک ایسی چاہ جو وقت کے ساتھ دب بھی سکتی تھی۔ابھر بھی سکتی تھی!
باس سے حکم ملنے کے دوسرے دن جب وہ اس سے ملا تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔
کیوں کیا بات ہے؟ بہت پریشان لگ رہی ہو۔''
وہ خاموش رہی۔
''بتاؤ تو، کیا بات ہے۔''
''تمہیں کیا بتاؤں؟ بس یوں سمجھ لو کہ اب میرا خاتمہ یقینی ہے۔''
''ارے کھل کر بات کرو نا۔کیا کہہ رہی ہو؟''
''ہمارے گروپ کے دو سینئر لیڈر آج شام مجھے ایک خفیہ مکان پر بلا رہے ہیں مجھ سے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے۔وہ کئی دنوں سے اپنے مقصد کے لیے مجھ پر زور

دے رہے ہیں اور میں ٹالتی آ رہی ہو۔آج انھوں نے تحکمانہ انداز میں مجھے وہاں بلایا ہے اور میں وہاں جانا نہیں چاہتی۔کنور میں وہاں نہیں جانا چاہتی کیوں کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔مجھے بچالو کنور۔''

''سنو تم ضرور جاؤ وہاں۔اور مجھے وہ مکان دکھا دو چلو ابھی دکھادو یقین کرو میں تمہیں بچالوں گا۔تم اس مکان کے اندر کسی محفوظ جگہ پر چلی جانا۔''

اور اسی شام میجر کنور نے اپنے جوانوں کے ساتھ اس مکان پر دھاوا بول دیا۔جب دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی تو میجر سوچ رہا تھا۔اس لڑکی نے یہ کام تو یقیناً کمال کا کر دیا۔اپنی عصمت کو داؤں پر لگا دیا۔ان دو بدنام زمانہ دہشت گردوں کا خاتمہ اس لڑکی کی ہمت کی وجہ سے ہوگا۔وہ کوشش کرے گا کہ باس اس لڑکی کی سزا معاف کر دے!اس لڑکی کو ختم کر دینے کا حکم واپس لے لے۔تو وہ اسے دہشت گردی سے دور کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دے۔چاہے وہ اسے اپنا بنا لے۔

سات آٹھ گھنٹے کی مسلسل فائرنگ اور گولہ باری کے بعد جب وہ اس مکان کے اندر داخل ہوا تو وہاں اسے ان دونوں کی لاش کے علاوہ اس لڑکی کی لاش بھی ملی۔اس کا سر کٹا ہوا تھا اور اس کی لاش کے پاس ہی رکھا تھا!!!

پتھر پہ کھُدا دل

جب سے اُسے پتہ چلا تھا کہ اس کے پاپا اس کے اصلی پاپا نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اس کے پاپا کے انتقال کے بعد اس کی ممی سے شادی کی تھی، اس دن سے وہ اپنے آپ کو اس گھر میں ایک اجنبی سا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک فالتو انسان۔ اسے پاپا کے پیار میں مصنوعی پن نظر آنے لگا تھا اور ممی کے پیار میں کھوکھلا پن۔ اسے ممی پر غصہ بھی آتا۔ کیا ضرورت تھی ممی کو دوبارہ شادی کرنے کی؟

ہریت جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن اچانک اسے اپنے چاچا سے پتہ چلا کہ اس کے پاپا تو گزر چکے ہیں اور اس کی ممی نے ان کے گزر جانے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلے تو وہ چاچا کی بات سمجھ ہی نہ پایا۔ چاچا یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ پاپا جنھیں ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک پاپا ہی سمجھا اس کے پاپا نہیں ہیں۔ اور پھر اچانک اس پر اصلیت اپنی تمام بے رحمیوں کے ساتھ ظاہر ہوگئی۔ اور اس کی نظروں کے سامنے وہ تصویر گھوم گئی جو اس نے اکثر اپنے چاچا کے البم میں دیکھی تھی جس تصویر میں اس کی ممی ایک شخص کی بغل میں کھڑی تھی اور اس شخص نے ایک چھوٹے سے بچے کو اٹھایا ہوا تھا جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ بچہ وہ خود تھا اور وہ شخص اس کے پاپا کا دوست تھا۔ اس کا انکل۔ اس نے چاچا سے پوچھا۔

''چاچا۔ جو تصویر آپ کے پاس ہے، اس تصویر میں جنھوں نے مجھے اٹھایا ہوا ہے وہی میرے پاپا ہیں نا؟''

''ہاں ——''

''وہی جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میرے پاپا کے دوست تھے۔؟''

''ہاں۔وہی۔لیکن وہ تمہارے اس پاپا کے دوست تو تھے ہی ——''

اور پھر اسے چاچا سے ہی پتہ چلا کہ اس کے پاپا ایک ریل گاڑی کے حادثے میں ختم ہو گئے تھے۔اس وقت وہ صرف ایک برس کا تھا۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو اسے ایک کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا۔وہ پانچ برس اس اسکول میں رہا اور پھر اسے لکھنؤ کے لامارٹینز کالج میں داخل کروا دیا گیا۔جہاں اسے پھر ہوسٹل ہی میں رہنا پڑا۔اس کے پاپا آرمی میں تھے اور ہر دوسرے تیسرے برس ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔اس لیے ہر دوسری تیسری چھٹیاں اسے نئی جگہ گزارنی پڑتیں۔ویسے چھٹیوں میں اسے گھر آنا بہت اچھا لگتا تھا اور وہ دیکھتا کہ اس کے گھر آنے پر اس کے ممی پاپا بھی بہت خوش ہوتے۔اس کے قیام کے دوران وہ طرح طرح کے پروگرام بناتے۔پکنک،سنیما،کسی کو گھر میں دعوت میں بلانا یا کسی کے یہاں دعوت میں جانا اور پتہ بھی نہ چلتا کہ چھٹیاں کب ختم ہو گئیں۔لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ یہ اس کے پاپا ہی نہیں ہیں اس کے لیے ان سب باتوں میں کوئی مزا ہی نہ رہا۔اب چھٹیوں میں اسے گھر آنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔اس کا دل چاہتا وہ چھٹیوں میں بھی ہوسٹل ہی میں رہے لیکن وہ کالج کے قاعدے قانون کے تحت لمبی چھٹیوں میں ہوسٹل میں نہیں رہ سکتا تھا۔اسے مجبوراً گھر آنا پڑتا۔اور گھر میں وہ ممی پاپا کے درمیان رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا۔

اس کے اپنے پاپا کے نام پرکاش بھاٹیہ کی نسبت سے اسکول میں اس کا نام ہریت

بھاٹیہ درج کروایا گیا تھا جب کہ اس کے یہ دوسرے پاپا میجر موہن کپور تھے۔ جب تک اسے اصلیت کا پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے بھاٹیہ اور کپور کے فرق کو نہیں سمجھا تھا لیکن اب یہ فرق اس کے سامنے اچھی طرح واضح ہوگیا تھا۔

اس کی ممی نے یہ اچھا ہی کیا کہ اس کا نام اس کے باپ کے نام پر رہنے دیا اسے اس کے اس نئے پاپا کا نام نہیں دیا۔ ضرور ان دونوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہوا ہوگا کہ اس کا نام اس کے باپ کے نام پر ہی رہے گا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی ممی اور پاپا کو ان کے تئیں اس کے رویہ میں تبدیلی کا احساس ہوگیا۔ لیکن انھوں نے مصلحتاً اس بات کو نہیں چھیڑا تھا۔ بلکہ پاپا کے برتاؤ میں اب بھی اسے کوئی تبدیلی نظر نہ آتی۔ وہ اسی طرح اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز لے آتے، کوئی پتلون یا بش شرٹ کا کپڑا۔ پیسٹری یا کیک۔ اس کے من پسند گانوں کے کیسٹ یا کتابیں۔ وہ اسے پکنک یا سنیما کا پروگرام بنانے کے لیے بھی کہتے۔ اور اس وقت وہ بھی ان کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کرتا۔ بھلے ہی یہ برتاؤ ظاہر ی طور پر ہوتا۔

ممی نے اس کے پاپا کے انتقال کے بعد بھی اپنے سسرال والوں سے ناتا نہیں توڑا تھا۔ وہ اب بھی وہاں آتی جاتی تھی اگر چہ سال دو سال میں صرف ایک بار۔ اور وہ بھی ممی کے ساتھ اپنے دادا دادی، چاچا، چاچی سے ملنے جاتا۔ یہ چاچا اس کے پاپا کے بڑے بھائی تھے۔ اسے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے چاچا اور اس کے پاپا دو بھائی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اور ادھر یہ پاپا ماں باپ کی اکیلی اولاد تھے۔ اسے باتوں میں یہ بھی پتہ چل گیا کہ ممی کی دوسری شادی کروانے میں خود اس کے دادادادی نے نہ صرف یہ کہ اپنی رضامندی ظاہر کی تھی بلکہ شادی میں شرکت بھی کی تھی۔ اپنی بیوہ بہو کی شادی میں بس اس بات کا ضرور اطمینان کرلیا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کی ساری جائداد قانونی طور پر ہریت کے نام منتقل کروادی تھی اور اس کے لیے ایک اچھے پبلک اسکول

میں تعلیم کے اخراجات کا انتظام بھی کروادیا تھا۔

جب ممی کی دوسری شادی ہوئی تو پاپا کیپٹن تھے۔ جب وہ لامارٹیز کالج لکھنؤ میں داخل ہوا تو وہ میجر بن چکے تھے اور جب لامانٹیر کالج سے اس نے انٹرمیڈیٹ پاس کرلیا تو پاپا لیفٹیننٹ کرنل بن کر احمد نگر میں تعینات ہوگئے تھے۔ اسے اب لامارٹیز کے بعد آگے تعلیم کے لیے سوچنا تھا۔ احمد نگر سے پونا پاس تھا، ممی کے کہنے پر اس نے پونا میں ''بی کام''میں داخلہ لے لیا۔

پاپا احمد نگر میں دوسری بار آئے تھے پہلی بار اس وقت آئے تھے جب انھوں نے آرمی جوائن کی تھی انہی دنوں اس کی ممی کی شادی اس کے اپنے پاپا کے ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن یہ پاپا احمد نگر سے اپنے دوست کی شادی میں شرکت کے لیے نہ آئے۔ چھٹی نہ ملنے کا بہانہ کردیا۔ شادی کے دو برس بعد پوسٹنگ پر اودھم پور میں رہ رہے تھے۔ اپنے دوست کی وفات کی خبر انھیں ممی کے پتاجی یعنی اس کے نانا سے ملی تھی۔ اور وہ چھٹی لے کر ان لوگوں کے غم میں شریک ہونے کے لیے آگئے۔ اور پھر پورے ایک برس کے بعد جب وہ خود دو برس کا تھا ممی نے ان کے ساتھ شادی کرلی۔

اسے ممی کی شادی کے بارے میں کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ممی نے اچھا ہی کیا کہ اس وقت دوسری شادی کی جب وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ اگر وہ کچھ بڑا ہوجاتا اور تب ممی دوسری شادی کرتی تو اس کے ذہن میں ممی کی شادی کی یادرہ جاتی اور یہ یاد اسے اور بھی زیادہ کچوکے لگاتی۔

ممی کا خیال تھا کہ پونا میں داخلے کے بعد وہ ہر چھٹی میں پونا سے احمد نگر ان سے ملنے کے لیے آیا کرے گا۔ پونا سے احمد نگر کا بس کا سفر ڈھائی گھنٹے ہی کا تو تھا۔ لیکن وہ پہلی چھٹی ہی میں اپنے دوستوں کے ساتھ مہابلیشورم چلا گیا۔ اور اب وہ یہی کرتا۔ چھٹیوں میں بجائے گھر آنے کے دوستوں کے ساتھ پونا سے باہر کہیں گھومنے نکل جاتا۔

اس وقت وہ عمر کی اس منزل میں تھا جب ماں باپ اس کو زیادہ سختی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔اس کے ممی پاپا سمجھ گئے تھے کہ اس وقت وہ باغیانہ رو میں ہے۔ وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب وہ اپنے آپ کو سمجھالے گا اور اپنے پاپا اور ممی کے ساتھ اپنی محبت کا رشتہ پھر سے استوار کرلے گا۔کیا ہوا جو وہ اس کے اصل پاپا نہیں ہیں تو۔انھوں نے اسے پالا ایک باپ ہی کی طرح تھا۔اور پھر ممی تو اس کی اپنی ممی ہے۔

احمد نگر میں آئے ہوئے انھیں تقریباً ڈیڑھ برس ہو رہا تھا۔وہ صرف ایک بار دیوالی کی لمبی چھٹیوں میں ایک ہفتہ کے لیے گھر آیا تھا اور اس تمام عرصہ میں جب بھی تین چار دن کی چھٹیاں ہوئیں وہ یا تو ہوسٹل ہی میں رہا یا کسی دوسرے شہر گھومنے چل دیا۔کبھی کسی دوست کے ساتھ اور کبھی اکیلے ہی۔دوستوں کے ساتھ گھومنے کی اس عادت کے تحت اب کی بار وہ پانچ دن کی چھٹی میں اپنے دو دوستوں کو لیے احمد نگر آ گیا۔اور آتے ہی گھر میں بتا دیا کہ اس کے یہ دوست احمد نگر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ممی نے اور پاپا نے اس کے دوستوں کا نہایت صدق دل سے سواگت کیا۔اور ان کے اس مختصر سے قیام کو یادگار قیام بنانے کی حامی بھرلی۔

اسی روز شام کو وہ انھیں افیسرز کالونی میں بنے مندر، مسجد اور گورودواروں میں لے گئے۔دعا کے یہ تینوں گھر بہت ہی خوب صورت اور صاف ستھرے بنے ہوئے تھے اور انھیں پتہ چلا کہ ان کے دکھ دکھاؤ میں اس کے پاپا کی خاص دلچسپی کا بھی دخل تھا!اور پھر دوسرے دن شہر کے بازاروں کی سیر کے بعد وہ انہیں احمد نگر کا قلعہ دکھانے لے گئے جہاں تحریک آزادی کے دوران قومی لیڈروں کو نظر بند کر کے رکھا گیا تھا۔اس قلعہ میں اگر چہ آج کل آرمی کے دفاتر ہیں لیکن دو کمرے اس وقت کی یادگار کے طور پر رکھے گئے ہیں۔کمروں کے باہر ایک تختی پر انھوں نے لکھا دیکھا۔یہاں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد،آچاریہ کرپلانی وغیرہ کو نظر بند کر کے رکھا گیا تھا۔جواہر لال نہرو نے

''بھارت ایک کھوج'' کتاب اسی احمد نگر قلعہ میں قید کے دوران لکھی تھی۔ایک کمرے میں وہ سامان بھی رکھا ہے جو ہر لیڈر کو قید کے دوران دیا گیا تھا۔چار پائی، کرسی، مگ، بالٹی آئینہ وغیرہ۔اسی احمد نگر قلعہ سے نہرو جی نے اپنی بیٹی اندرا کو بھی خط لکھے تھے۔انھوں نے نہرو کی تحریر کے نمونے بھی دیکھے۔اور یہ سب دیکھ کر انھیں بہت اچھا لگا۔اسی روز شام کو ملٹری کلب کے ''اوپن ایر تھیٹر'' میں انھوں نے پکچر دیکھی۔

اگلے دن صبح ناشتے پر بیٹھے ہوئے ہریت بولا۔

ممی آج ہم لوگ صلابت خاں کا مقبرہ دیکھنے جائیں گے۔''

''اچھا۔لیکن بیٹا وہاں ہے ہی کیا۔یہاں سے کافی دور بھی ہے تقریباً تیس کلومیٹر۔ اور نہایت اوبڑ کھابڑ راستہ ہے''۔

''تو کیا ہوا۔پاپا جیپ کا انتظام کر دیں گے۔کیوں پاپا۔؟''

''ہیں......؟۔۔۔ہاں۔''

اس نے محسوس کیا کہ پاپا بھی نہیں چاہتے کہ وہ لوگ صلابت خاں کا مقبرہ دیکھنے جائیں۔پچھلی بار جب وہ احمد نگر آیا تھا تو بھی اس کے کہنے پر وہ اسے صلابت خاں کا مقبرہ دکھانے نہیں لے گئے تھے۔ٹال گئے تھے۔اسی کالونی میں رہنے والے اس کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ احمد نگر سے تھوڑی ہی دور صلابت خاں کا مقبرہ دیکھنے کی چیز ہے حالانکہ سرکار نے وہاں ٹورسٹ کی سہولت کے لیے کچھ بھی انتظام نہیں کیا۔وہاں پر پہنچنے کے لیے نہ کوئی سڑک ہے نہ چائے پانی کی کوئی دکان۔بالکل سنسان بیابان جگہ۔اسے دیکھنے کے لیے کبھی کبھار ہی کوئی جاتا ہے۔صرف وہی، جسے اس طرح کی پرانی عمارتوں کے دیکھنے کا شوق ہو۔اسے بھی شوق ہے۔دوستوں کے ساتھ وہ یہ مقبرہ دیکھنا چاہتا ہے تو یہ لوگ ٹال رہے ہیں۔وہ چڑ سا گیا۔

''دیکھیے پاپا۔اگر آپ جیپ کا انتظام نہ کر سکتے ہوں تو ہم لوگ کرایے کی گاڑی کا

انتظام کرلیں گے۔''

''ارے نہیں بھئی___میں انتظام کردوں گا۔''

پاپانے جیپ کا انتظام کردیا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ صلابت خاں کا مقبرہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوگئے تقریباً پچیس کلومیٹر پکّی سڑک پر چلنے کے بعد جیپ اس ٹیلے کی طرف چلی جس کے اوپر صلابت خاں کا مقبرہ بناہوا ہے۔ویسے مقبرہ بہت دور سے نظر آنے لگا تھا۔مقبرے تک جانے کے لیے گولائی میں گھومتاہواٹیڑھا میڑھا اوبڑ کھابڑ راستہ تھا۔زیادہ تر کچّا لیکن کہیں پتھریلا۔کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی اس راستے پر جاتی ہوگی۔پچھلی بار جب وہ احمد نگر آیا تھا تو اسے ممی نے بتایا تھا کہ وہ کچھ ہی روز پہلے صلابت خاں کا مقبرہ دیکھ آئے تھے۔اور پاپا تو دوسری بار گئے تھے۔پہلی بار اس وقت گئے تھے جب وہ آرمی جوائن کرنے کے بعد ٹریننگ کے لیے احمد نگر آئے تھے۔''لیکن بیٹا۔راستہ بہت خراب ہے یہ جیپ ہی ہے جو ایسے راستے پر جاسکتی ہے اور ہچکولے بہت کھانے پڑتے ہیں''۔اورممی نے یوں منہ بنایا تھا جیسے ابھی تک ان کے جسم پر ہچکولے کھانے کا اثر باقی ہو۔تقریباً بیس منٹ تک ہچکولے کھانے کے بعد وہ لوگ ہموار جگہ پر پہنچ گئے۔جہاں صلابت خاں کا مقبرہ بنا ہے پتھروں کے بلاکوں سے بنی یہ دومنزلہ عمارت جسے صلابت خاں نے اپنی زندگی ہی میں بنوالیا تھا۔اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر۔صلابت خاں احمد نگر کے چوتھے بادشاہ مرتضیٰ نظام شاہ اول کا وزیر تھا۔اس وقت اپنی بیگم کے ساتھ زمین سے نیچے کھدی منزل پر بنی قبروں میں ابدی نیند سورہا ہے۔

سب سے پہلے وہ لوگ سیڑھیوں سے نیچے اتر کران قبروں تک گئے۔انھیں مقابلتاً یہ ٹھنڈی اور صاف ستھری جگہ لگی۔شام کے چار بجے کے قریب بھی پتھر کی دیواروں میں سے کاٹ کر بنائے گئے روشن دانوں میں سے چھن چھن کر آرہی روشنی کی وجہ سے قبریں

صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ چاروں طرف گھوم کر اور چند سیکنڈ وہاں پر رک کر وہ لوگ اوپر آ گئے۔ مقبرے کا چبوترا نہایت صاف ستھرا تھا جیسے روزانہ کوئی جھاڑو لگاتا ہو۔ لیکن جھاڑو نہیں لگائی جاتی تھی اتنی اونچائی پر ہوا میں دھول مٹی ذرا بھی نہ تھی بلکہ وہاں کی تیز ہوا چبوترے کی صفائی بھی خود ہی کر دیتی۔ چبوترے سے اوپر کی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں سامنے ہی دکھائی پڑیں۔ لیکن ابھی ان کا موڈ ستانے کا تھا۔ ایک تھیلے میں ممی نے کچھ پھل رکھ دیے تھے۔ کیلا، سیب اور امرود۔ جو اس وقت تو وہ لوگ منع کرتے رہے تھے لیکن اب ان سب کو بھوک محسوس ہوئی اور انھوں نے جلد ہی وہ سب پھل کھا ڈالے۔

''یار۔ یہاں پر تو سو جانے کا دل کرتا ہے''۔ اس کا ایک دوست پتھر کے اس فرش پر لیٹ گیا۔

''ارے اٹھو۔ چلو پہلے اوپر چل کر دیکھ آئیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے دوست بھی اس کے ساتھ ان سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ کافی تنگ سیڑھیاں تھیں۔ ایک ایک کر کے ہی اوپر جا سکتے تھے۔ اوپر پہنچنے تک وہ تینوں ہانپ گئے۔ لیکن پتھر کی دیواروں میں بنی بڑی بڑی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے پر وہ جیسے اپنی ساری تھکاوٹ بھول گئے۔ انہیں واقعی بہت مزا آیا۔ اور پھر اسی طرح کی دیوار میں بنی پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ دوسری منزل پر آ گئے۔ پہلی منزل کی طرح یہاں پر بھی پتھر کی چوڑی سی دیوار میں چاروں طرف کھڑکیاں بنی تھیں۔ یہاں پر ہوا اور بھی زیادہ صاف اور ٹھنڈی تھی۔ مقبرہ خود بھی ٹیلے پر بنا تھا۔ اور یہ اس کی دوسری منزل تھی انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی پہاڑ پر پہنچ گئے ہوں۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ اوپر چھت پر جانے کے لیے بھی سیڑھیاں بنی تھیں۔

''چلو اوپر چھت پر چلتے ہیں۔'' اس نے کہا لیکن اس کے دوست نہیں مانے۔ ''اوپر چھت پر کیا رکھا ہے۔؟'' اور وہ لوگ واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ مجبوراً اسے بھی ان

کے ساتھ نیچے آجانا پڑا۔

''اب یہاں کچھ دیر لیٹا جائے۔''اور اس کے دوست اس چبوترے پر لیٹ گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے بھرنے لگے۔لیکن اس کا دل اسے پھر اوپر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔اوپر،ہی نہیں اوپر چھت پر۔ وہ اٹھا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔پہلی منزل پر کچھ دیر سستایا اور پھر وہ اوپر چھت پر گیا۔ یہاں پر اسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں بیچوں بیچ چھت گنبد کی طرح گول بنی تھی۔اور وہ ہمت کر کے وہاں اس گنبد نما جگہ پر پہنچ گیا اسے یوں لگا جیسے وہ سب سے الگ ایک انسان ہو۔ نیچے سوئے ہوئے دوستوں سے ہی نہیں ہر انسان سے الگ۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔اوپر آسمان تھا اور نیچے زمین۔اور زمین پر اسے بہت دور وہ سڑک دکھائی دے رہی تھی جس پر سے گزر کر وہ لوگ آئے تھے۔ایک پتلی سُرمئی لکیر کی سی سڑک۔اور پھر اس نے چھت پر اپنے چاروں طرف دیکھا تو اسے اس گنبد نما حصے کے چاروں طرف مڈیر پر جگہ جگہ نام کھدے ہوئے نظر آئے۔وہ گنبد سے اتر آیا اور منڈیر پر کھدے نام پڑھنے لگا۔اسماعیل۔ رضیہ، ڈیسائی، رنگا ناتھن، رادھا،نگوشکر،مرزا،ششما۔ارے !تو اس سے پہلے اور بھی کئی لوگ یہاں آچکے ہیں!۔آتے رہتے ہیں اپنے دائیں طرف منڈیر پر اچانک اس نے دیکھا۔کیپٹن موہن کپور۔ارے!یہ تو اس کے پاپا کا نام ہے!وہ اس نام کی طرف بڑھ آیا اور اس نے دیکھا کہ اس نام کے نیچے دل کی تصویر کھدی ہوئی تھی جس میں ایک تیر پیوست تھا اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔رشمی۔اس کی حیرت اور دلچسپی بڑھ گئی۔اس نے ایک بار پھر پڑھا۔رشمی۔یعنی اس کی ممی۔کیپٹن موہن کپور اور رشمی۔صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پاپا جب کیپٹن تھے،جب ان کی پہلی پوسٹنگ ہوئی تھی یہاں احمد نگر میں۔تو وہ یہاں آئے تھے۔انھوں نے اس وقت یہ نام کھودے بیچ میں دل کی تصویر اور اس میں پیوست ایک تیر۔تو ممی کو پاپا اس وقت سے جانتے تھے جب وہ کیپٹن تھے۔صرف جانتے

ہی نہیں تھے بلکہ چاہتے بھی تھے اور اس کے کانوں کی لویں گرم سی ہوگئیں۔

وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا ان ناموں کو پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا اور سوچتا رہا اور پھر اچانک اسے اس کے دوستوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں وہ اسے نیچے آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ واپسی میں تمام راستے اس کی نظروں کے سامنے اس کے پاپا اور ممی کا نام گھومتا رہا۔ کیپٹن موہن کپور رشمی۔ اور وہ اپنے دوستوں کی باتوں کا جواب ''ہوں'' ''ہاں'' میں دیتا رہا۔ اور جب وہ گھر پہنچے تو اس کے پاپا اور ممی ان لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔

''کیوں کیسا رہا ٹرپ؟'' اس کے پاپا نے ان لوگوں سے پوچھا۔

''ارے انکل۔ بڑا مزا آیا۔'' اس کے دوست بولے۔

''اور پاپا میں تو اوپر چھت پر بھی گیا تھا۔ اوپر گنبد پر۔''

''ارے! سچ''!

''گڈ۔'' پاپا نے معنی خیز نگاہوں سے ممی کی طرف دیکھا۔ اور پھر ایک فوجی افسر کے سے انداز میں اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان سے ہاتھ مِلا رہا ہے۔ اپنے دل میں اپنے اس پاپا کے لیے ایک انوکھی محبت محسوس کر رہا ہے۔ ساری نفرت اس کے دل سے یک دم کافور ہوگئی ہے۔ اس نے دیکھا ممی کے چہرے پر بھی خوشی تھی اور ساتھ ہی تھوڑی سی لالی بھی۔

کایا پلٹ

رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ گھر لوٹا تھا۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ خاموش سہمی نگاہوں سے کبھی اس کی طرف اور کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑی نوری کی زنجیر اور پٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر خوف زدہ سی اپنی پلنگ کی طرف چلی گئی اور پھر وہ بھی زنجیر اور پٹے کو ایک کونے میں پھینک، کپڑے تبدیل کرنے کے بعد چپ چاپ ساتھ کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے رات کے اندھیرے میں دیکھا اس کا بیٹا ساتھ والے کمرے میں سے اٹھ کر آیا ہے اور اپنی ماں کے پلنگ کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا ہے اور نہایت مدھم لہجے میں ماں سے پوچھتا ہے۔

''کیا پاپا سچ مچ نوری کو دریا میں پھینک آئے۔؟''

''ہاں لگتا تو ہے۔ تم باہر جا کر دیکھ آؤ۔ کہیں اسے باہر تو نہیں چھوڑ آئے؟''

'اچھا'' لڑکا چپکے سے اٹھا۔ اور پھر آواز کئے بغیر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ماں کے پاس آیا اور اسی طرح اس کے سرہانے کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے مگر بھاری آواز میں بولا۔ ''وہ باہر تو کہیں بھی نہیں ہے۔ پاپا سچ مچ اسے دریا میں پھینک آئے۔''

نگم جب شام کو دفتر سے لوٹا تو بہت پریشان تھا۔ دفتر میں اس نے ایک گمنام

شکایتی خط تیار کیا تھا جو اس نے دفتر کے ساتھی کھنڈ لوال کے خلاف لکھا تھا۔ جس نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آئے دن باس سے اس کی شکایتیں کرتا رہتا حتیٰ کہ دو تین بار اس سے صفائی بھی مانگی جا چکی تھی۔ اور اب دو دن پہلے کھنڈ لوال نے باس سے شکایت کی کہ وہ وقت سے پہلے دفتر چھوڑ گیا ہے اور پچھلے کئی دنوں سے وقت سے پہلے چلا جاتا ہے۔ باس نے اسے بلا کر ڈانٹ دیا تھا۔ اس نے اسی وقت کھنڈ لوال سے بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس نے کھنڈ لوال کے خلاف کچھ ثبوت اکٹھے کئے اور پھر ایک شکایتی خط تیار کیا جسے وہ ایک ہی دو روز میں باس کے پاس بھجوا دے گا۔ گھر آتے ہی اس نے وہ خط میز پر رکھ دیا۔ اسی خیال سے کہ کچھ دیر ستانے کے بعد وہ اس خط پر نظر ثانی کرے گا۔ جیسے ہی وہ صوفے پر بیٹھا۔ نوری دم ہلاتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ اور وہ اس کے منہ کی طرف دیکھ کر چونک اٹھا۔ ''ارے! یہ کیا کیا تم نے نوری؟ آج پھر تم نے لوسی کے ایک بچے کو مار ڈالا؟!'' وہ نوری کے منہ پر لگے خون کے داغ دیکھ رہا تھا۔ نوری دم ہلاتی ہوئی ڈری ڈری سی اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی جیسے اس کے پاؤں میں گر کر اس سے معافی مانگ رہی ہو! ابھی تین ہی چار روز پہلے اس نے لوسی کے ایک بچے کو مار دیا تھا۔ اور اس نے نوری کی خوب پٹائی کی تھی۔ پہلے اسے زنجیر سے باندھا تھا پھر اسے چھ سات بیت جڑ دئے تھے۔ نوری چلائی تھی۔ بلبلائی تھی لیکن اس نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ بیت مارتے وقت بیچ بیچ میں وہ اسے لوسی کا مرا ہوا بچہ بھی دکھاتا جاتا۔

''یہ دیکھ ـــــ یہ دیکھ سالی! تو نے کیا کیا؟؟ ـــــ لوسی کا ایک بچہ مار ڈالا۔ میرے ڈیڑھ ہزار روپے کا نقصان کر دیا ـــــ آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا ـــــ'' اور پھر اسے یوں لگا جیسے نوری جان گئی ہے کہ اسے کس قصور کی سزا ملی ہے ـــــ اس نے نوری کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اسے گلے سے لگا لیا۔ نوری ''کوں کوں'' کرنے لگی ـــــ دم ہلانے لگی ـــــ وہ سچ مچ اپنی مار بھول گئی تھی ـــــ لیکن آج ـــــ؟ آج اس نے لوسی کے ایک

اور بچے کو مار ڈالا تھا ـــــ

شروع شروع میں جب نگم کے دل میں کتا پالنے کا شوق پیدا ہوا تو وہ اپنے ایک دوست کے یہاں سے کراس بریڈ (Cross Breed) کا ایک بچہ لے آیا۔ ایک مادہ بچہ۔ اس کا نام اسی نے نوری رکھا۔ شاید یہ اس کی کراس بریڈ کا اثر تھا کہ نوری بہت عقلمند ثابت ہوئی۔ بہت سے اشارے سمجھ گئی ـــــ ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ اور ان کے بچوں کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتی ۔ وہ ایسی خوبصورت تو نہ تھی لیکن اپنی عقل، سوجھ بوجھ اور کھیلنے کودنے کی وجہ سے ان سب کو پیاری لگتی تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ گھر کا ہی ایک فرد تھی۔ اور نگم کو تو وہ بہت زیادہ عزیز تھی۔ وہ اسے صبح و شام ٹہلانے کے لیے لے جاتا۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے ساتھ کھیلتا تو دفتر کی ساری تھکاوٹ دور ہوجاتی وہ بیمار ہو جاتی تو جانوروں کے کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرواتا۔ ایک بار اس کے پیٹ میں رسولی ہوگئی تو اس نے اس کے پیٹ کے آپریشن اور علاج پر تقریباً ایک ہزار روپے خرچ کر ڈالے ـــــ اور اب نوری پانچ برس کی ہوگئی تھی لیکن اس نے نوری کو کراس نہیں کروایا ـــــ ایک تو اس لیے کہ وہ خالص نسل کی نہ تھی۔ دوسرے اس لیے کہ وہ اس کے بچوں کو کہاں سنبھالتا پھرے گا ـــــ کس کس کو دیتا پھرے گا ـــــ کیا پتہ کوئی اس کے بچوں کو پالنا بھی چاہے گا یا نہیں ـــــ یہی سب سوچ کر اس نے اسے کراس نہیں کروایا ـــــ یعنی ماں بننے کے اس کے فطری جذبے کو دبا ڈالا!۔ جب وہ ہیٹ (Heat) میں ہوتی تو فرش پر گرے اس کے خون کے دھبّوں کو اس کی بیوی پونچھتی تو ضرور پھرتی لیکن قدرت کی طرف سے اس صریحاً اشارے کو وہ ہمیشہ نظر انداز کر دیتے۔

اور پھر ایک دن وہ ایک خالص نسل کا پامیرین (Pomerian) بچہ خرید لایا ـــــ مادہ بچہ ـــــ اس پامیرین مادہ بچے کو خریدنے میں یا اسے پالنے میں اس کے شوق کو اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ اس کی تاجرانہ ذہنیت کو ـــــ وہ اسے خالص پامیرین کتے سے کراس

کروائے گا اور پھر اس کے بچے فروخت کرے گا۔ اس نے پچھلے کئی برسوں میں دیکھا تھا کہ خالص نسل کے کتوں کے بچے خوب بکتے ہیں۔ اور وہ اسے اس پلان کے مطابق پالنے لگا___ اس کا نام اس نے ''لوسی'' رکھا___ لوسی کی پرورش میں اس نے نوری کی طرف اپنی توجہ یا التفات کو کم نہیں ہونے دیا___ نوری نے بھی لوسی کو جیسے اپنی چھوٹی بہن مان لیا تھا___ وہ اس کے ساتھ خوب ہل مل گئی تھی___ اسی سے کبھی لڑی جھگڑی نہ تھی___ کئی دفعہ تو وہ دونوں ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتیں___

پہلی بار ہی لوسی کے چار بچے ہوئے___ اور ایک ہفتہ کے اندر ہی سب بک بھی گئے۔ بارہ بارہ پندرہ پندرہ سو کا ایک بچہ___ لیکن خریدنے والے کچھ ایڈوانس رقم جمع کر کے ایک ماہ کا بچہ ہو جانے کے بعد ہی بقیہ رقم دے کر بچے لے جانے کا سودا کر گئے۔

لوسی کے بچے ہوئے تو پہلے تو وہ نوری کو اپنے اور اپنے بچوں کے نزدیک آنے ہی نہ دیتی تھی۔ غرانے لگتی___ لیکن پھر دو ہی تین دن کے بعد اس نے نوری کو اپنے نزدیک آنے کی اجازت دے دی۔ نگم اور اس کے گھر والے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ نوری لوسی کے پاس ان بچوں کے سامنے لیٹ جاتی اور بچے اس کے تھنوں کو منہ میں لے کر دودھ پینے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے بعد مایوس ہو کر اس کے تھنوں کو چھوڑ دیتے۔ گھر والوں کو اتنا اطمینان تو ہو ہی گیا کہ نوری لوسی کے بچوں پر اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھی۔

لیکن چار ہی پانچ روز کے بعد اس نے ایک بچے کو مار ڈالا تھا۔ اپنے منہ میں دانتوں تلے دبا کر___ ان لوگوں کے خیال و گمان میں بھی نہ تھا کہ نوری ایسا بھی کر سکتی ہے! وہ جوان پر اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھی!___ چھوٹے سے معصوم بچے نے آخر ایسا کیا کیا تھا کہ نوری کو غصہ آ گیا___؟! نوری کو سزا دینے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو تنبیہ کر دی کہ نوری کو ان بچوں کے پاس نہ جانے دے۔ ہر وقت اسے باندھ کر رکھے۔ لیکن

اس کی بیوی نے اس طرف خاص دھیان نہیں دیا اور اس نے دوسرے بچے کو مار ڈالا ــــ چار میں سے دو بچے مر گئے یعنی اس کا تین ہزار کا نقصان ہوگیا۔

''ریتا! ــــ او ریتا! ــــ'' وہ زور سے چلایا۔ جب کہ اس کی بیوی ریتا پاس ہی کچن میں تھی ــــ

''کیا ہے؟ چلا کیوں رہے ہو ــــ؟'' وہ اس کے پاس آئی۔

''دیکھو! ۔ ادھر دیکھو ــــ'' اس نے مردہ بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہے ــــ؟ ارے! یہ کیا ــــ؟ نوری نے اسے بھی مار ڈالا ــــ؟'' وہ سہمی سی ہوئی اس کی طرف دیکھنے لگی ــــ

''ہاں ۔ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ــــ تم نے نوری کو کھلا چھوڑ دیا تھا ــــ میرا کہا نہیں مانا ــــ ادھر گھر میں تم لوگ پریشان کرتے ہو۔ اور ادھر دفتر میں وہ ہرامزادہ کھنڈلوال ــــ اسے تو میں بعد میں دیکھوں گا ــــ پہلے تم لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ میں آج اس نوری کو یہیں ختم کیے دیتا ہوں۔'' اور وہ جلدی سے نوری کی طرف لپکا ــــ نوری خود ہی اس کی گرفت میں آ گئی۔ جیسے سزا پانے کے لیے تیار ہو ــــ

''کیا کرو گے ــــ؟ اسے مار ڈالو گے کیا ــــ؟''

''ہاں ــــ آج میں اسے ختم کر دیتا ہوں ــــ تم لوگوں کی یہی سزا ہے ــــ'' اور اس نے نوری کے گلے میں پٹہ ڈال دیا ــــ اور زنجیر باندھ دی ــــ اور اسے لے کر باہر جانے لگا۔

''کہاں لے جا رہے ہو اسے ــــ؟''

''دریا میں پھینکنے کے لیے ــــ'' اس نے سامنے کھڑی ریتا کو ایک طرف دھکیل دیا۔ باہر جا کر اسی نے اسکوٹر کے پیچھے نوری کو بٹھا دیا اور اس کی زنجیر اسکوٹر کے ساتھ باندھ دی۔ نوری چپ چاپ سنبھل کر اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ گئی۔ پہلے بھی وہ اکثر اسکوٹر پر

اس کے ساتھ گئی تھی لیکن اس نے ہمیشہ اسے آگے کھڑا کیا تھا۔ بغیر زنجیر کے ــــ وہ دو پاؤں پر کھڑی ہو جاتی اور اگلے دو پاؤں اسکوٹر کے ہینڈل پر ٹکا دیتی۔ اور اس طرح اس کی ٹانگوں کے بیچ میں آ جاتی۔ اور بڑی خوش دکھائی دیتی۔ لیکن آج اس نے اسے اسکوٹر کے پیچھے بٹھا دیا تھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ تو گئی لیکن بڑی بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ اور نم کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ۔ کہ وہ اسکوٹر پر سے کود نہ جائے!۔ اس کو باندھنا ضروری تھا۔ اب اگر وہ کودے گی تو اسکوٹر کے ساتھ لٹکی رہ جائے گی مر بھی سکتی ہے۔ مر گئی تو اور اچھا ہے۔ اسے زندہ کو دریا میں نہیں پھینکنا پڑے گا۔ وہ اسکوٹر کو تیز اور تیز چلانے لگا۔ اس بات سے بے پروا کہ اسکوٹر کے پیچھے نوری سیٹ کے ساتھ چپکی بیٹھی ہے۔ ڈری ڈری سی۔ سہمی سہمی سی۔ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے۔ اسکوٹر کی سیٹ میں اپنے پنجے گڑائے ہوئے۔

رات کے دس بج رہے تھے ــــ اور وہ اب بازار میں سے نکل کر کھلی سڑک پر آ گیا تھا ــــ وہ دریا کے اس پل پر جانا چاہتا تھا جہاں اس وقت مقابلتاً کم ٹریفک ہوگی ــــ ٹریفک واقعی بہت کم تھی ــــ اکا دکا اسکوٹر یا کار کسی وقت نکل جاتی اور پھر اسی کا اسکوٹر چل رہا ہوتا ــــ

''سالی نے دو بچوں کو مار ڈالا ــــ اسے تو ختم کر دینا ہی اچھا ہے ــــ اگر زندہ رہی تو باقی کے بچوں کو بھی مار ڈالے گی ــــ مجھے اب اس کا کرنا بھی کیا ہے۔ یہ دو بچے جو مر گئے ہیں۔ یہ دونوں بک چکے تھے۔ ان کا ایڈوانس مل چکا تھا۔ اب ایڈوانس واپس کرنا پڑے گا ــــ نوری کے بارے میں، ان دو بچوں کے بارے میں، اور ان کے بک جانے پر دیے گئے ایڈوانس کے بارے میں ــــ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے خیالوں میں کھنڈلوال آ گیا۔ ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں اس کے لیے تمسخر تھا، نفرت تھی اور شرارت تھی ''سا ــــ لا ــــ'' اس کے منہ سے کھنڈلوال کے لیے

ایک گالی نکلی۔ اور اسے یاد آیا کہ اس کے خلاف جو وہ ایک گمنام خط لکھ رہا ہے اسی میں ایک بات تو لکھنا بھول ہی گیا۔ پچھلی بار جب کھنڈلوال دفتر کے کام سے بمبئی ٹور پر گیا تھا۔ تو اس نے اپنے ٹی۔ اے بل میں ریل کا کرایہ تو فرسٹ کلاس کا وصول کیا تھا لیکن گیا وہ سیکنڈ کلاس میں تھا۔ اسے یہ بات ایک دوست کے ذریعہ پتہ چلی تھی جو اتفاقاً اسی کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا جس میں کھنڈلوال جا رہا تھا۔ یہ بات بھی اس شکایتی خط میں لکھ دے گا۔ بچے گا کیسے سالا۔''

اب وہ پل آ گیا تھا جہاں سے اس نے نوری کو دریا میں پھینکنا تھا ـــــ پل کے بیچ میں پہنچا تو اس نے اسکوٹر کو ترچھا کھڑا کر دیا اس طرح کے وہ دونوں طرف دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر تک اسکوٹر پر بیٹھا، وہ دونوں طرف دیکھتا رہا ـــــ کوئی آ تو نہیں رہا۔؟ رات کے اس وقت اسے نوری کو دریا میں پھینکتے ہوئے دیکھ کر ضرور کوئی شک کر سکتا ہے ـــــ نہ جانے کیا پھینکا ہے اس نے دریا میں ـــــ؟ کوئی لاش؟ اسے دور دور تک کوئی بھی نظر نہ آیا ـــــ وہ اسکوٹر پر سے اتر آیا۔ اور اس نے پچھلی سیٹ سے نوری کو کھول کر اٹھا لیا۔ نوری بہت بھاری تھی۔ پل کی ریلنگ تک پہنچنے ہی میں وہ تھک گیا۔ نوری کو اٹھائے ہوئے اس نے ریلنگ پر سے نیچے دریا کی طرف جھانکا۔ دریا بہت نیچے تھا۔ ٹھیک ہے۔ یہاں سے پھینکنا ٹھیک رہے گا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ کہ نوری کا پٹہ اور زنجیر تو اس نے اتاری ہی نہیں۔ زنجیر اور پٹہ اتار لینا چاہئے۔ اسے کیوں ضائع کیا جائے۔ اس نے نوری کو زمین پر رکھا اور اس کے گلے میں سے پٹہ اور زنجیر اتاری۔ اور اسے پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور اسی وقت اس کی نگاہ نوری کی طرف گئی۔ نوری اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ اور ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نیچے کی طرف دیکھا اور اپنی پوری طاقت سے نوری کو ذرا پرے اچھال دیا۔

اس نے دیکھا نوری نے فوراً اپنے اگلے پاؤں سر کے متوازی اوپر کی طرف موڑ لیے تھے جیسے خود ہی دریا میں غوطہ لگانے جا رہی ہو۔ دوسرے لمحے اسے چھپ کی آواز سنائی دی اور نوری پانی کی سطح سے نیچے چلی گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور بغیر دائیں بائیں دیکھے اسکوٹر کے پاس آ گیا۔ اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اور اس وقت وہ اپنی بیڈ پر سیدھا لیٹا تھا۔ دم سادھے۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا اپنی ماں سے بات کرنے کے بعد نہایت آہستہ قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی دوسری طرف کروٹ بدل لی تھی۔ نوری کو دریا میں پھینک آنے کے بعد نہ ہی وہ کچھ بولا تھا نہ اس کی بیوی نے یا لڑکے نے اس سے کوئی بات کی تھی۔

اور اب تو اسے لیٹے ہوئے بھی ایک گھنٹہ ہو گیا تھا ـــــ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے نظر آ رہی تھی نوری دریا میں گرتے ہوئے۔ اپنے سر اور اگلے دونوں پاؤں کا رخ نیچے دریا کی طرف کیے ہوئے اتنی اونچائی سے پانی میں گرنے کی وجہ سے، وہ شدید چوٹ لگنے سے ہی مر گئی ہوگی ـــــ! اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں نوری کو ہلاک کر دے گا۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے تو وہ مجبور ہو گیا تھا ـــــ نوری نے ہی اسے مجبور کر دیا ـــــ اگر ایسا نہ کرتا وہ سب بچوں کو مار دیتی ـــــ اسی ختم کر دیا ٹھیک ہی کیا ـــــ لیکن پھر اسے بے چینی سی کیوں ہے؟ اس کا دل کیوں بھاری ہے ـــــ اور وہ پھر سونے کی کوشش کرتا۔ اسے لگتا جیسے اس کی بیوی بھی کروٹیں بدل رہی ہے ـــــ نیند اسے بھی نہیں آ رہی ہے ـــــ چند منٹ کے لیے آنکھ لگی تھی کہ نوری کے بھونکنے کی آواز سن کر جاگ گیا ـــــ لیکن نوری ـــــ؟ نوری وہاں کہاں تھی ـــــ؟ وہاں ـــــ؟ وہاں تو صرف سناٹا تھا ـــــ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رات کو کبھی کبھی ہلکا سا کھٹکا سن کر نوری بھونکنے لگتی تھی یا غرانے لگتی تھی تو وہ جاگ جاتا تھا۔ اس کے لاشعور

میں یہی نوری کے بھونکنے آواز رہی ہوگی جو آج نیند میں اسے سنائی دے گئی اسی طرح دو تین بار ہوا اور ہر بار وہ چونک اٹھا۔ بے چینی، نیم غنودگی اور بار بار چونک اٹھنے ہی میں رات گزر گئی۔ صبح سویرے اس کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن ایک گھنٹہ ہی سویا ہوگا کہ اسے پھر نوری کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کی بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ اور دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا اس کا بیٹا ـــــ آنکھیں کھول کر وہ اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا کہ نوری کے بھونکنے کی آواز پھر سنائی دی ـــــ وہ شک میں پڑ گیا ـــــ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔؟!

اور اب نوری کے بھونکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی ـــــ کیا نوری کی آواز اسے اب بیداری میں بھی سنائی دینے لگی؟!۔ اُف! لیکن یہ کیا ـــــ؟ یہ بھونکنے کی آواز تو باہر گیٹ پر سنائی دے رہی ہے ـــــ اس نے اپنی پوری توجہ اس بھونکنے کی طرف لگا دی ـــــ اور پھر وہ یکدم اٹھا ـــــ اور ''نوری ـــــ''، ''نوری'' چلاتا دروازہ کھول کر باہر گیٹ کی طرف لپکا ـــــ اس نے دیکھا ـــــ گیٹ سے باہر گیٹ کی طرف منہ کر کے نوری بھونک رہی تھی! ـــــ اس نے جلدی سے گیٹ کھولا ـــــ''

''نوری! ـــــ ارے نوری ـــــ تم...... تم زندہ ہو ـــــ؟! تم بچ گئیں ـــــ؟!''

نوری اچھل اچھل کر اس کے ہاتھ چومنے لگی ـــــ اس کے بال گیلے تھے اور اس کے پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے۔ لیکن اس نے اسے اٹھا لیا۔

اس وقت اس کی بیوی اور بیٹا دونوں ہی گیٹ پر آ گئے تھے ـــــ

''ارے! یہ تو نوری ہے ـــــ؟! نوری بچ گئی ـــــ؟ آپ تو اسے دریا میں پھینک آئے تھے نا ـــــ؟'' اس کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں میں اسے ہلاک کر آیا تھا ـــــ لیکن یہ بچ گئی! ـــــ اور پھر راستہ تلاش کرتے کرتے گھر بھی پہنچ گئی ـــــ'' کیچڑ میں لت پت نوری کو اپنے ساتھ چمٹائے، اس

کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اندر آرہا تھا۔ رات کو دریا میں پھینکتے وقت نوری اسے بہت بھاری لگی تھی۔ لیکن اس وقت اسے محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ نوری کو اٹھائے ہوئے ہے____

اور وہ اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں آ گیا____

''لو بیٹا____ اب تم اترو____'' اور اسے اتار کر وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔

''دیکھو! اب اسے ان بچوں سے الگ رکھنا۔ اب اگر اس نے کوئی بچہ مار دیا نا۔ تو میں تم کو پیٹوں گا۔ سمجھی!____ ویسے اب ہم اس کو بھی ماں بنائیں گے۔ اس کے بھی بچے ہونے چاہئیں۔ ہاں____''

اور پھر وہ سامنے میز کی طرف گیا جہاں کھنڈلوال کے خلاف شکایتی خط لکھا رکھا تھا۔ اس نے وہ خط اٹھالیا۔ چند لمحے اس خط کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

عبادت گاہ

آزاد ـــــ یہ ان کا نام نہیں تھا۔ لیکن اب وہ اسی نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کا اصل نام اب ان کے دفتر کے کچھ لوگ ہی جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بھی ان کا ذکر یا ان کو مخاطب ''آزاد صاحب'' کہہ کر ہی کرتے ـــــ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اب کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتنا سب جانتے تھے کہ وہ ہر مذہب کی عزت کرتے تھے۔

ان کا اصل نام، ان کے پیدا ہوتے ہی، روایت کے مطابق ان کے والدین ہی نے رکھا تھا۔ اور اس نام سے یقیناً ان کے مذہب کا بھی پتہ چلتا تھا۔ لیکن جب وہ باشعور ہوئے تو انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ''آزاد'' کا لقب لگا لیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے ان کا یہ لقب ہی ان کا نام ہو گیا ـــــ اور لوگ ان کے اصل نام کے ساتھ ان کا مذہب بھی بھول گئے!

وہ ایک بہت بڑی کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اور ان کی ڈیوٹی میں دورہ بھی شامل تھا۔ اور انہیں سفر اچھا بھی لگتا تھا۔ سفر کے دوران تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے علاوہ، جدید و قدیم عبادت گاہوں میں جانا، چاہے وہ کسی بھی مذہب کی ہوں، ان کے شوق میں شامل تھا۔ ہر مذہب کی عبادت گاہ میں وہ نہ صرف جاتے، بلکہ چند منٹ کے لیے وہاں رک کر، کبھی کسی کونے میں کھڑے ہو کر، کبھی کسی جگہ بیٹھ کر اپنے مالک کو یاد

بھی کرتے ۔ان کا عقیدہ تھا کہ وہ مالک ہر جگہ موجود ہے ۔کسی خاص مذہب کی عبادت گاہ میں محدود نہیں ــــ وہ لامحدود ہے ــــ اس مالک کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر مذہب کا ہے۔

انہیں کسی عبادت گاہ میں، چند منٹ گزارنے میں سکون بھی ملتا تھا۔ وہ کہا کرتے۔ ''ہر عبادت گاہ میں لوگ اچھے خیالات لے کر جاتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں۔ اپنے مالک کی حمد و ثنا میں بھجن یا گیت گاتے ہیں۔اس لیے وہاں کا ماحول اچھی لہروں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہاں جانے والے ہر شخص کے دل و دماغ پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔اسے سکون ملتا ہے ۔مسرت حاصل ہوتی ہے ۔اور اسی سکون یا مسرت کی تلاش ہی تو انسان کی زندگی کا اصل مقصد ہے!''

اب کی بار وہ جس شہر میں آئے ہیں۔ وہاں ایک قدیم عبادت گاہ ہے لیکن وہ ان کے مذہب والوں کی نہیں ہے ۔دوسرے مذہب والوں کی ہے ۔اپنے عقیدے کے مطابق اس عبادت گاہ میں جانے کا شوق ان کے دل میں اُمڈ آیا ہے ۔ان کے ساتھ ان کا ایک ماتحت بھی ہے۔ وہ اتفاق سے اسی شہر کا رہنے والا ہے ۔وہ ان کا اصل نام اور مذہب جانتا ہے۔اس ماتحت کا اپنا مذہب وہی ہے، جس مذہب والوں کی یہ عبادت گاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس عبادت گاہ میں دوسرے مذہب والوں کے داخلے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔شروع شروع میں تو اکثر غیر مذہب والوں کو، پتہ لگنے پر، باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ پریکٹس نہیں ہے ۔ اب غیر مذہب والے خود ہی اندر نہیں جاتے۔ اور اگر کوئی چلا بھی جاتا ہے ۔تو اندر، بالکل اندر کے کمرے میں ،جہاں بیٹھ کر لوگ دعائیں مانگتے ہیں یا دھیان کرتے ہیں، داخل نہیں ہو پاتا۔ اسے دروازے پر ہی گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے اور وہیں سے پلٹ جاتا ہے۔

آزاد صاحب کو ان کے ماتحت نے یہ سب کچھ بتا دیا ہے ــــ

''سر۔ ہم لوگ اندر کے کمرے میں نہیں جائیں گے۔ یعنی میں بھی نہیں جاؤں گا۔ کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی ۔ ہم لوگ باہر گھومیں گے۔ باغیچہ دیکھیں گے۔ روز گارڈن (Rose Garden) دیکھیں گے۔ آڈیٹوریم اور لائبریری دیکھیں گے۔ اور لان میں بھی بیٹھیں گے۔''

''ارے چلو تو۔ وہاں پہنچنے کے بعد سوچیں گے۔''

آزاد صاحب کے جواب سے ان کے ماتحت کا دل کانپ گیا۔ وہ آزاد صاحب کے اشتیاق اور ارادے کی پختگی سے واقف تھا۔ اسے آزاد صاحب کے ساتھ اپنی بھی بے عزتی صاف نظر آنے لگی۔ آخر وہ ایک غیر مذہب والے کو اس عبادت گاہ میں لے ہی کیوں آیا____؟ وہ اس عبادت گاہ کے لیے نیا تو نہیں تھا۔ اسی شہر کا ہونے کی وجہ سے وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ یہاں کے کارکن اسے جانتے تھے۔

آزاد صاحب نے اور اس ماتحت نے عبادت گاہ کے باہر بنی دکانوں سے اگربتی کا پیکٹ، دیا سلائی اور کچھ پھول خریدے اور یہ سب ایک ڈونگے میں سجا کر عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ عبادت گاہ کی روایت کے مطابق، چاروں طرف گھومنے اور مخصوص جگہوں پر اگربتی جلانے اور پھول رکھنے کے بعد، وہ دونوں اب اس اندرونی کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ماتحت کو آنکھیں بند کیے دیکھ کر آزاد صاحب نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

''سر! ہم اس کمرے کے اندر نہیں جائیں گے۔ کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔'' تھوڑی دیر پہلے کہے ماتحت کے الفاظ ان کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اور انہیں سچ مچ گھبراہٹ سی ہونے لگی____ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ گھبراہٹ جاتی رہی۔ انہیں لگا جیسے ان سے کوئی کہہ رہا ہے۔

''وہ جس کا دھیان اندر بیٹھے یہ سب لوگ کر رہے ہیں۔ اس نے کسی کو منع نہیں کیا

اندر آنے کے لیے۔ وہ منع کر ہی نہیں سکتا۔ وہ ایشور بھی ہے۔ اللہ بھی۔ پرماتما بھی ہے۔ مولا بھی۔ پربھو بھی ہے۔ خدا بھی ہے۔ بھگوان بھی ہے۔ رب بھی ہے۔ گاڈ بھی ہے۔ اور۔ اور......اس کے نام انیک ہیں۔ لیکن وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ لیکن وہ ہر مذہب کا ہے۔ جو اندر بیٹھے ہیں، وہ ان سب کا مالک ہے۔ تمہارا بھی ہے۔ وہ تمہیں اندر آنے کے لیے نہیں روک رہا ہے——''

اور وہ اندر چلے گئے۔ اور چپ چاپ ایک جگہ بیٹھ گئے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر جانے کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ ان کا ماتحت اس کمرے میں نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ان سے پہلے باہر چلا گیا ہو؟۔ وہ باہر آئے تو وہ باہر بھی نہیں کھڑا تھا۔ وہ باہر دروازے پر کھڑے، چاروں طرف نظریں دوڑاتے اس کا انتظار کرنے لگے۔

چند منٹ بعد انہوں نے اسے سامنے سے آتے دیکھا۔

''سر۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟—— سر۔ میں آپ کو سب جگہ تلاش کر آیا۔ صدر دروازے کے باہر جا کر بھی——؟''

''ارے! تو تم میرے ساتھ کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے؟''

''نہیں سر! جب میں نے آنکھیں کھولیں۔ تو آپ وہاں نہیں تھے۔ میں نے سمجھا آپ گھبرا کر باہر چلے گئے ہیں۔ اُس لیے میں آپ کو تلاش کرنے لگا۔''

''ارے!'' وہ اس سے آگے کچھ نہیں بولے۔

جب وہ اپنے ماتحت کے ساتھ باہر آرہے تھے۔ تو ان کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ ان کا ماتحت اب بھی ڈرا ہوا تھا!

موت کے منہ میں

جموں سے سری نگر جانے والی ویڈیو کوچ جب متواتر دو گھنٹے چل چکی اور ویڈیو پر لگی فلم تقریباً آدھی ختم ہو چکی تو ڈرائیور نے سڑک کے کنارے بنے ایک ٹی اسٹال کے پاس بس روک دی۔ اس ٹی اسٹال کا مالک ڈرائیور کا دوست تھا اور یہاں اس کو اور کنڈکٹر کو مفت ناشتہ ملتا تھا۔ بس کے رکتے ہی کنڈکٹر نے اعلان کر دیا کہ یہاں پورے بیس منٹ بس رکے گی۔ چنانچہ سب مسافر ایک ایک کر کے اتر آئے۔ یہاں موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ بادل بھی گھر آئے تھے اور ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ کوئی مسافر چائے پی رہا تھا تو کوئی گرم گرم پکوڑے کھا رہا تھا۔ اور کوئی یونہی ٹہل رہا تھا۔ بیس منٹ کے بجائے ڈرائیور نے پورا آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ جب سب مسافر بیٹھ گئے اور کنڈکٹر نے احتیاطاً مسافروں کی گنتی کر لی کہ کوئی مسافر چھوٹ تو نہیں گیا یا کوئی نیا مسافر تو یہاں سے نہیں بیٹھ گیا۔ تو اس نے بس چلنے کی وسل دے دی۔ لیکن جس وقت سب مسافر بس کے باہر تھے اور بس کی موجودگی سے بے نیاز ناشتہ کر رہے تھے یا ادھر ادھر ٹہل رہے تھے تو اس وقت ایک نیا مسافر بس میں آ ہی گیا تھا۔ جسے نہ تو کسی مسافر نے بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا اور نہ ہی کنڈکٹر یا ڈرائیور نے۔ یہ مسافر تھا ایک کالا لمبا سانپ جو بس کے پائیدان پر سے ہوتا ہوا بس کے اندر آ گیا تھا! حالانکہ اس وقت بس

ایسے رخ پر کھڑی تھی کہ بس کا دروازہ پہاڑ کی جانب نہ ہو کر سڑک کی طرف تھا اور ٹی اسٹال پر کھڑے مسافروں کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ اور بس کے اندر جانے والا کسی نہ کسی کی نگاہ میں آسکتا تھا۔ لیکن وہ کالا سانپ نہ جانے کیسے سب کی نظریں بچاتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا تھا۔؟

بس کے اندر پہنچ کر اور نہایت اطمینان سے بس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک سیٹ کا انتخاب بھی کر لیا تھا اور اس سیٹ کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا تھا۔

جس سیٹ کے نیچے وہ سانپ بیٹھا تھا اس سیٹ پر بیٹھنے والا مسافر اپنے اس مہمان کی آمد سے بے خبر ویڈیو فلم دیکھنے میں محو تھا جو کنڈکٹر نے بس کے روانہ ہوتے ہی پھر سے لگادی تھی۔ اس کی طرح دوسرے سب مسافر بھی فلم دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے سوائے دو تین کے جنہیں اس فلم میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو اونگھ رہے تھے۔ اور پھر اس سانپ کی موجودگی کا احساس ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے نہ تو کسی کو دکھائی دے رہا تھا نہ اس کے پاس سے کوئی آواز آ رہی تھی اور نہ کوئی خوشبو یا بدبو۔ وہ خود بھی ان مسافروں کی مصروفیتوں سے لاپروا سیٹ کے نیچے کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

کچھ دیر تو وہ سانپ یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلا اور آہستہ آہستہ اس مسافر کی ٹانگ کے پاس آ گیا۔ پھر اس کے بوٹ پر سے ہوتا ہوا اس کی پتلوں کے پائنچے پر اور پھر تھوڑا سا اور اوپر پہنچ کر اس نے اس کی پتلوں سمیت اس کی ٹانگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور پھر جیسے ہی اس نے اپنی لپیٹ کو کسا اس مسافر کو اپنی ٹانگ پر ایک عجیب سی جکڑن کا احساس ہوا۔ ایک موٹی سے رسی سے ٹانگ کو باندھ دیے جانے کا احساس! اس کا ہاتھ آپ ہی آپ اس کی ٹانگ کی طرف گیا اور سر نیچے کی طرف جھکا۔ سانپ کے چکنے جسم کا لمس اور اس کی خوفناک جھلک دونوں

نے ایک ساتھ اس پر اثر کیا۔ اور جیسے اس کی جان ہی تو نکل گئی۔

''سا......سا......'' اس کی آواز اس کے گلے میں ہی اٹک گئی۔

سانپ کی گول گول چمکدار آنکھیں، اور ٹانگ کے گرد اس کے تین چار۔ لپیٹ۔ یہ سب اس کی نگاہوں میں کھُب سے گئے ـــــ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ خوف! دہشت! سراسیمگی!!

اس نے ہمت کر کے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کو کہنی ماری ـــــ اس کی اپنی سیٹ کھڑکی کے پاس والی سیٹ تھی اور ساتھی مسافر باہر والی سیٹ پر بیٹھا تھا ـــــ ساتھی مسافر نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے اشارے سے اسے اپنی سیٹ کے نیچے جھانکنے کے لیے کہا۔ اس کی آواز اب بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی ـــــ

ساتھی مسافر نے جب سیٹ کے نیچے دیکھا تو یکبارگی اپنی سیٹ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور بس کے بیچ کے راستے میں پڑے سامان سے ٹکراتا لڑکھڑاتا آگے کی طرف بڑھا اور پھر دبی دبی آواز میں چلایا۔

''سانپ ـــــ سانپ ـــــ''

''کہاں ـــــ؟ کہاں ـــــ؟'' بس میں خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ

''کہاں ہے بھئی'' ـــــ؟'' کہاں ہے ـــــ؟''

''وہاں ـــــ اس سیٹ کے نیچے ـــــ اس سیٹ کے نیچے ـــــ''

ڈرائیور گاڑی روکو ـــــ گاڑی روکو ـــــ کنڈکٹر صاحب گاڑی رکوایئے ـــــ''

دبی دبی آوازیں ـــــ گھٹی گھٹی چیخیں ـــــ

اور ڈرائیور نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی ـــــ

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب مسافر بس میں سے باہر نکل آئے ـــــ سوائے اس مسافر کے جو ڈر کے مارے اپنی سیٹ پر بیٹھا ہل جل بھی نہیں رہا تھا۔ سیٹ پر سے اٹھ کر

کھڑے ہو جانا تو درکنار۔

چند منٹ کے بعد باہر کھڑے مسافروں میں سے ایک مسافر نے بس کے پائیدان پر کھڑے ہو کر ہولے سے اسے آواز دی۔

''بھائی صاحب !۔۔۔او بھائی صاحب ۔۔۔باہر آجاؤ ۔۔۔آہستہ آہستہ اٹھو۔۔۔اور ہولے ہولے چل کر باہر آجاؤ۔۔۔باہر آجاؤ۔۔۔''

لیکن اس مسافر سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔۔۔اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اٹھنے کی ۔۔۔اس کی سمجھ میں یہی آرہا تھا کہ وہ اسی جگہ بیٹھا رہے ۔۔۔اٹھے گا تو ٹانگ ہلے گی ۔۔۔ٹانگ ہلے گی تو سانپ ہلے گا۔۔۔اور سانپ ہلے گا تو سانپ کاٹ بھی سکتا ہے۔

''اوئے اٹھ کر باہر آجا۔۔۔باہر آجانا۔۔۔آہستہ آہستہ ۔۔۔ہولے ہولے ۔۔۔''اب پائیدان پر دو تین مسافر کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔کبھی اشاروں میں اسے اٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے اور کبھی دھیمی آواز میں۔

اور پھر اس نے ہمت کر ہی ڈالی۔۔۔وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا بغیر اس ٹانگ کو ہلائے جلائے جیسے وہ ٹانگ اس کے جسم کا حصہ ہی نہ ہو!

''ہاں شاباش۔۔۔اب باہر آجاؤ۔۔۔آہستہ آہستہ قدم رکھ کر۔۔۔سنبھل سنبھل کر۔شاباش۔'' وہ بے چارگی سے پائیدان پر کھڑے ان مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ کیسے قدم بڑھائے؟؟ لیکن قدم بڑھانے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔۔۔

اس نے ایک بار پھر ہمت بٹوری۔سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے۔ اپنی تمام تر توجہ سانپ کے قبضے میں پھنسی اپنی دائیں ٹانگ کی طرف مرکوز کرتے ہوئے وہ ایک قدم اپنے بائیں طرف یعنی سیٹوں کے باہر کی طرف اور کھسکا۔اور پھر اسی طرح دوسرا قدم۔ اور وہ سیٹوں کے باہر تھا۔ اس کی ہمت اب بڑھ گئی تھی۔آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا۔ بڑی ہوشیاری سے اپنی ٹانگ کو راستے میں رکھے سامان سے بچاتا وہ دروازے کے پاس

آ گیا۔ اور پھر اسی طرح احتیاط کے ساتھ نیچے زمین پر بھی اتر آیا۔ ہانپتا سا ہوا۔ گھبرایا سا ہوا۔ یوں جیسے کئی میل پیدل چل کر آیا ہو۔ مسافروں نے دیکھا کہ سانپ اپنی گول گول چمکدار آنکھوں سے ان سب کو گھورتا ہوا دائیں بائیں جھوم رہا تھا۔ زبان لپلپا رہا تھا۔ جیسے ان کو بتا دینا چاہتا ہو کہ اگر مجھ پر وار کیا تو میں بھی چھوڑوں گا نہیں۔ ہاں، البتہ پہل میں نہیں کروں گا۔

وہ مسافر آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک کے کنارے بنی منڈیر پر جا بیٹھا۔ جہاں مسافر پہلے سے ہی بیٹھے تھے۔ لیکن جب وہ جا کر بیٹھا تو وہاں بیٹھے مسافر اس سے فاصلے پر ہو گئے۔ بہت سارے مسافر سامنے کھڑے اس کو اور اس سانپ کو دیکھ رہے تھے۔ اور سانپ اس کی ٹانگ پر اسی طرح لپٹا ہوا تھا۔ نہ تو اس مسافر کو کاٹنے کے موڈ میں تھا اور نہ اسے چھوڑ کر چلے جانے کے موڈ میں۔ وہ مسافر بھی سانپ کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اور اب اس کا ڈر کافی حد تک جاتا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی جس وقت وہ اس کی طرف دیکھتا۔ اس کے جھومتے ہوئے سر کی طرف۔ اس کی لپلپاتی ہوئی زبان کی طرف۔ تو اس کا ڈر عود کر آتا۔ اور اس کے بدن میں کپکپی سی ہونے لگتی۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سانپ کو اس مسافر کی ٹانگ پر سے کیسے ہٹایا جائے۔!

وہ سب لوگ آپس میں سانپوں کے بارے میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ سانپوں کے قصے سانپوں کی قسمیں۔ سانپوں کی عادتیں۔ زہریلے سانپ۔ غیر زہریلے سانپ۔ خشکی کے سانپ۔ پانی کے سانپ۔ پہاڑی سانپ۔ میدانی سانپ۔ ہرے، پیلے، کالے، سفید طرح طرح کے رنگوں کے سانپ۔ ہر آدمی سانپوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا۔ لیکن ایسی حالت میں، اس سنسان بیابان جگہ پر اس بے بس مسافر کی ٹانگ پر سے سانپ کو کیسے ہٹایا جائے یہ کوئی نہیں بتا پا رہا تھا۔

''اگر کوئی سپیرا مل جائے تو شاید!''

''لیکن اس سنسان جگہ پر سپیرا کہاں سے آئے گا؟''

پانچ منٹ۔ دس منٹ۔ پندرہ منٹ۔ اور پورا آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا لیکن وہ سانپ تھا کہ اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔

اور اب مسافر بار بار اپنی گھڑیاں دیکھ رہے تھے۔ اور اب سب سے زیادہ بے تاب تھے ڈرائیور اور کلینر۔

آخر کب تک پڑے رہیں گے یہاں؟'' ایک مسافر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے سب مسافر اس کے ہم خیال ہو گئے۔

ڈرائیور بولا۔

''مجھے تو اگلے اسٹاپ پر اب سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں تو پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔ اور اب......''

''لیکن اسے یوں موت کے منہ میں چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتے۔'' ایک مسافر نے ہمدردی ظاہر کی۔

''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ سانپ اپنے آپ چلا جائے گا۔ جب یہ شخص چپ چاپ بیٹھا رہے گا نا۔ اسی طرح۔ اور یہاں کوئی بھی نہ ہوگا تو سانپ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگ پر سے ہٹ جائے گا۔ اور چلا جائے گا۔ دیکھ لینا۔''

''دیکھ کیا لینا۔ اکیلے میں تو ڈر کے مارے اس کی جان ہی نکل جائے گی۔ دیکھ نہیں رہے ہو، اس کا رنگ کیسا پیلا ہو رہا ہے؟''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' وہی مسافر جس نے چل دینے کا خیال ظاہر کیا تھا بولا۔

''آپ ہی اس کے پاس ٹھہر جائیے نا۔''

بس کنڈکٹر نے سنا تو کہنے لگا____

''ہاں کوئی بھی ایک جنا اس کے پاس ٹھہر جائے۔ اور میں دونوں کے لیے ایک پرچی لکھے دیتا ہوں۔ ہماری ٹرانسپورٹ کمپنی کی ابھی تین بسیں ادھر سے گزریں گی____ ان میں سے کسی میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ کوئی دوسری بس بھی پکڑ سکتے ہیں۔ یہاں سے سری نگر تک کا کرایہ لوٹا دوں گا____''

''اچھا ٹھیک ہے____ میں رہوں گا یہاں اس کے پاس____ جائیے آپ سب لوگ____''

اور سب مسافر جلدی جلدی بس میں سوار ہوگئے____ کنڈکٹر نے جلد جلد پرچی لکھی اور ان دونوں کا کرایہ اسے دے دیا____ اور بغیر وِسل بجائے بس کی طرف لپکا____ اسی دوران دو مسافروں نے ازراہ ہمدردی ان دونوں کا سامان بس میں سے نکال کران کے پاس رکھ دیا____

بس چلی تو ان میں سے کئی مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر اس مسافر کو دیکھ رہے تھے۔ اس سانپ کو بھی جواب تک اس مسافر کی ٹانگ پر لپٹا ہوا تھا۔

لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بس کے چلے جانے کے پورے پندرہ منٹ کے بعد اس سانپ نے اس مسافر کی ٹانگ پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اور پھر آہستہ آہستہ کمال ہوشیاری سے، ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اس کی ٹانگ پر سے اتر کر زمین پر آ گیا۔ اور بل کھاتا لہراتا سڑک پار کر کے سامنے پہاڑ کی طرف جانے لگا۔ وہ دونوں حیرت زدہ اور خوشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے جب تک کہ وہ پہاڑ کی ایک چٹان کے پیچھے غائب نہیں ہو گیا۔

وہ مسافر جس کی ٹانگ پر سانپ اتنی دیر تک لپٹا رہا تھا یوں اٹھا جیسے موت کے منہ سے واپس آ گیا ہو اور دوسرا مسافر اس کی طرف یوں بڑھا جیسے اس کا کوئی اپنا سگا بھائی

ایک بہت بڑے خطرے سے بچ کر آ گیا ہو۔ اور وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔

لیکن ٹھہریے ۔۔۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ۔۔۔ تھوڑا سا دم لے کر، کافی حد تک اس واقعہ کے اثر سے آزاد ہو جانے کے بعد، جب وہ اپنا اپنا سامان اٹھائے پیدل ہی اس طرف چلنے لگے جس طرف کہ بس گئی تھی اور جس طرف کہ انہیں جانا تھا اس خیال سے کہ اگر پیچھے سے کوئی بس آتی دکھائی دی تو وہ اسے روک لیں گے۔ یا اگلے بس اسٹاپ تک پہنچ ہی جائیں گے۔ ایک موٹر سائیکل سوار نہایت تیزی سے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ ان کے پاس آ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل روک لی اور بولا۔

''بھائی صاحب! کوئی بھی بس ادھر سے گزرے تو اسے روک لیجئے گا۔ یہاں سے تھوڑی دور پر لینڈ سلائیڈ ہو گیا ہے۔ اور وہ بس جو ابھی گئی تھی نا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ پہلے۔ وہ عین اسی وقت وہاں سے گزری۔ لینڈ سلائیڈ کے وقت۔ اور کھڈ میں گر گئی۔ گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی۔ اور ایک مسافر بھی نہیں بچا۔ کنڈکٹر اور ڈرائیور کوئی بھی نہیں بچا۔ میں پاس کے تھانے میں خبر دینے جا رہا ہوں۔

ابھی تو درد باقی ہے

اور آخر میں نے نکھل کے ساتھ شادی کے لیے ہاں کر دی۔ نکھل جو میرے مرحوم شوہر کیلاش کا چھوٹا بھائی ہے۔ یہ ''ہاں'' میں نے کن جذبوں کے تحت کی تھی یہ میں ہی جانتی ہوں ــــ اپنی بے بسی، اپنے ماں باپ کی خوشی اور اپنے ساس سسر کی خواہش ــــ ان سب کا مجھے احساس تھا۔

مجھے پتہ چلا تھا کہ نکھل بھی میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے آسانی سے راضی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس نے تو ''ہاں'' میرے ''ہاں'' کرنے کے بعد کی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے مجھ سے بات بھی کر لی۔ وہ بہت جوش سے بھرا میرے کمرے میں آیا۔ اور آتے ہی بولا۔

بھابھی!...... یہ ممی اور پاپا کس طرح کی بات سوچ رہے ہیں؟''

''کیسی بات''؟ میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہی کہ ہم دونوں......'' وہ آگے کچھ نہ بولا ــــ اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

''اوہو! تو تم کیا سوچتے ہو اس کے بارے میں؟ ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ ان کی اس بات کا ہمیں سوچ سمجھ کر جواب دینا چاہئے ــــ لیکن زیادہ تر فیصلہ تو تمہارے ہی اوپر منحصر ہے'' ــــ کہتے کہتے میرے کانوں کی لوئیں بھی گرم ہو گئیں۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا ــــ چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا ــــ پھر چپ چاپ

اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا____

کیلاش کی موت کے تیرھویں ہی دن میرے سسر جی نے مجھے دوسری شادی کے لئے سمجھانا شروع کر دیا تھا____ کہتے۔

''دیکھو سیما____ زندگی کی راہیں بہت مشکل اور ٹیڑھی میڑھی ہیں____ ان پر تم اکیلے نہیں چل سکوگی____ اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے صرف چھبیس سال____ اور تم یہ بھی تو سوچو کہ اگر تم نہ رہتی تو کیا کیلاش دوسری شادی نہ کر لیتا____؟ صرف تین برس تک کے ساتھی کی یاد میں اپنی بقیہ زندگی نہیں گزاری جا سکتی____ اور پھر عورت کے لیے اور بھی مشکل ہے زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا۔''

اس وقت ان کی باتوں کا جواب میرے پاس سوائے آنسوؤں کے کچھ نہ تھا____ میرے ممی اور ڈیڈی نے بھی مجھے اسی طرح کی نصیحتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ان سب کو کیلاش کے مرنے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنی اس بات کی چنتا تھی کہ میرے لیے مناسب لڑکا تلاش کر کے میری دوسری شادی کر دیں____ ان کے لیے میں ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی اور وہ جلد سے جلد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے!

کیلاش نے ان تین برسوں میں مجھے بے انتہا پیار دیا تھا۔ ان تین برسوں کے ہمارے پیار کی اتنی خوبصورت یادیں تھیں کہ ان یادوں کے سہارے پوری زندگی گزاری جا سکتی تھی! لیکن میرے ماں باپ اور میرے ساس سسر یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے____

کیلاش ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے بزنس ٹور پر جاتے تھے____ ان کا یہ ٹور چار پانچ روز سے زیادہ کا کبھی نہ ہوتا____ اور پھر واپس آنے کے بعد دو تین دن تو کام پر ہی نہ جاتے۔ میرے ساتھ گھومنے پھرنے میں گزار دیتے____ اور یہ دیکھ کر ان کی ممی ہنس کر کہتیں____

''جب شادی نہیں ہوئی تھی تو پندرہ بیس دن سے پہلے لوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا اور

پھر آتے ہی کام پر جُٹ جاتا تھا۔۔۔۔ اور اب دیکھو کتنی جلدی واپس آجاتا ہے۔اور آنے کے بعد دو تین چھٹیاں بھی مار دیتا ہے۔۔۔۔''

ان کے پاپا ان کی می کی ہنسی کا جواب یوں دیتے۔۔۔۔ ''بھئی ،اس نے شادی سے پہلے خوب محنت کر کے بہت ساری چھٹیاں کما کر رکھ چھوڑی تھیں۔۔۔۔ اور اب وہ چھٹیاں اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر رہا ہے۔جب وہ چھٹیاں ختم ہو جائیں گی تو پھر محنت کرلے گا۔۔۔۔''

لیکن چھٹیاں ختم نہ ہوئیں اور وہ چل بسے۔۔۔۔

ہر بار دورے سے لوٹنے کے بعد کہتے۔۔۔۔

''سیما! اگلی بار پاپا سے کہہ کر تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔۔۔۔''

''جی نہیں۔۔۔۔ میں آپ کے ساتھ جا کر کیا کروں گی۔۔۔۔ آپ تو دن بھر کام کے سلسلے میں گھومتے پھریں گے اور میں ہوٹل میں بیٹھی بور ہوا کروں گی۔۔۔۔''

اور وہ ہنس کر کہتے۔۔۔۔

''ارے نہیں یار۔۔۔۔ تم ساتھ ہو گی تو صرف دو گھنٹے کے لیے مارکیٹ میں جاؤں گا۔۔۔۔ سچ۔۔۔۔ دس بجے سے بارہ بجے تک۔۔۔۔ اور اس کے بعد سارا دن تمہارے ساتھ۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور ساری رات بھی۔۔۔۔''

ان کے اس جملے سے لطف اندوز ہوتی ہوئی میں اگلے ٹور پر ساتھ چلنے کا وعدہ کر دیتی۔۔۔۔ لیکن ہر بار جب وہ جانے لگتے میرا ساتھ جانا کینسل ہو جاتا۔۔۔۔ کبھی تو وہ خود ہی جھجک سی محسوس کرنے لگتے پاپا سے پوچھنے میں۔۔۔۔ اور کبھی ان کا پروگرام اس دورے میں ایک ایک دن میں دو دو اسٹیشن نپٹانے کا بن جاتا۔اور ایسی حالت میں میرا ساتھ جانا ناممکن ہو جاتا۔۔۔۔

اور پھر یوں ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بن گئی۔۔۔۔ جب تک یہ بچہ بڑا نہ ہو جاتا

کہاں جاسکتی تھی ــــ؟

لیکن اس آخری باران کا مدراس جانے کا پروگرام بنا تو بولے ــــ

''سیما! اب کی تم بھی تیار ہو جاؤ ــــ اگر تم ساتھ ہوگی تو مدراس میں آٹھ دس دن رہ لیں گے ــــ اور اس کے بعد ایک سٹیشن اور وزٹ کریں گے اور پھر واپس ــــ''

انہوں نے پاپا کی بھی رضامندی لے لی ــــ اور ممی نے بھی کہہ دیا ــــ

''بٹو کو میں سنبھال لوں گی ــــ تم جاؤ ــــ''

لیکن ان کے جانے سے دو دن پہلے بٹو کو بخار آ گیا ــــ اور مجھے اپنا ریزرویشن کینسل کرانا پڑا ــــ اس وقت میرا دل زور سے دھڑکا ــــ ایسا تو دل پہلے کبھی نہ دھڑکا تھا ــــ ؟! دل چاہنے لگا کہ میں ان کے ساتھ ہی چلی چلوں ــــ بٹو کا بخار تو دو چار دن میں اتر ہی جائے گا ــــ لیکن قسمت کو میرا ساتھ جانا منظور نہ تھا۔ میں دل کی بات زبان پر نہ لا سکی ــــ جب وہ رخصت ہونے لگے تو دل پھر بے چین ہو اٹھا ــــ ایسی بے چینی تو پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی ؟! مجھے لگا وہ بھی بے چین ہیں ــــ میرا دھیان بٹانے کے لیے بولے ــــ

''تم ہمیشہ سوبر (Sober) قسم کی ساڑھیاں پہنتی ہو ــــ اب کی میں تمہارے لیے گہرے شوخ رنگ کی خوبصورت ساڑھیاں لاؤں گا ــــ''

میں مسکرادی ــــ ایک اداس سی مسکراہٹ ــــ انہوں نے مجھے بانہوں میں بھرلیا ــــ میرا دل چاہا وہ مجھے زور سے بھینچیں ــــ خوب زور سے ــــ تاکہ میری بے چینی دور ہو جائے ! لیکن انہوں نے مجھے فوراً چھوڑ دیا۔ شاید کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تھی ! لیکن کوئی نہ آیا ــــ اور وہ چل دیئے اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے ــــ وہ جب بھی دورے پر جاتے پہلے مجھ سے وداع ہوتے اور بعد میں ماں باپ سے ــــ جب واپس آتے تو پہلے ماں باپ سے ملتے اور بعد میں مجھ سے ــــ

''نہ جانے مجھے آج کیا ہو رہا ہے؟ بیٹھے بیٹھے سارا جسم سن سا ہو جاتا ہے___ جیسے کسی نے جان ہی کھینچ لی ہو___''

میں نے اپنی ساس سے کہا ان کے جانے کے پورے پانچ دن بعد___ مجھے کیا پتہ تھا کہ اسی روز انہوں نے یہ دنیا چھوڑ دی تھی___

کیلاش کے مرنے کی اطلاع ہمیں ان کی موت کے چار دن بعد ملی___ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ رات کو کسی نے ان کا گلہ گھونٹ کر مار دیا___ اوران کے پاس جو چھ سات سو روپے نقد تھے وہ لے گیا___ قاتل نے شاید سمجھا کہ ان کے پاس بہت سا روپیہ ہے___ یا ہوسکتا ہے کہ اس تھوڑی سی رقم کے لیے ہی انہیں مار ڈالا ہو! میں اتنی دور بیٹھی تھی لیکن پھر بھی میرا دل دو تین روز سے بہت بے چین تھا۔

میں بٹو کو کھلا رہی ہوتی___

سات سمندر پار سے
گڑیوں کے بازار سے
اچھی سی گڑیا لانا

پپا جلدی آجانا___ گڑیا چاہے نہ لانا۔ پپا جلدی آجانا___ پپا جلدی......

تو میرا گلا اچانک رندھ جاتا___ آپ ہی آپ میرے آنسو نکل آتے۔ بٹو حیرت زدہ میری طرف دیکھنے لگتی___ اور کہتی___

''پاپا چھک چھک سے آئیں گے نامی___؟''

''ہاں بیٹی___''

''کب آئیں گے پاپا___؟''

''آجائیں گے بیٹی___ بہت جلد آئیں گے___ ''اور میں اس کو سینے سے لگالیتی___

ان کی لاش چار دن ہوٹل کے کمرے میں بند پڑی رہی۔ ہوٹل والوں نے اس وقت کمرے کا دروازہ توڑا جب کمرے میں سے بدبو آنے لگی ــــ ان کا کہنا تھا وہ یہی سمجھتے رہے کہ کمرے میں ٹھہرنے والا کمرہ بند کر کے کہیں چلا گیا ہے اور چار دن میں لوٹ آئے گا ــــ اندر سے آٹو میٹک بند ہوجانے والے دروازے کی وجہ سے مارنے والا انہیں مارنے کے بعد دروازہ بند کر کے چلا گیا ــــ دروازہ توڑا گیا تو ان کی لاش بستر پر پڑی ملی۔ جسم گل چکا تھا جب ہمارے کچھ رشتہ دار لاش کو لے آنے کے لیے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا لاش لائی نہیں جا سکتی تھی ــــ چنانچہ انہوں نے ان کا انتم سنسکار وہیں کر دیا ــــ وہ لوگ صرف ان کے ''پھول'' لے آئے۔ جس شکل میں میں نے انہیں واپسی کے بعد دیکھا وہ صرف چند ہڈیاں تھیں، پیتل کے ایک برتن میں رکھی ہوئیں ــــ وہ خود کہاں چلے گئے ؟! میں کس کس ہڈی کو گلے لگاؤں۔؟! میں ان کی ایک ایک ہڈی کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دینا چاہتی تھی لیکن مجھے ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔ وہ تمام ہڈیاں جلدی سے مجھ سے الگ کر دی گئیں اور دوسرے دن ان کو گنگا میں بہا دینے کے لیے ہردوار بھجوا دیا گیا ــــ ان ہڈیوں کے ساتھ وہ ساڑھی بھی مجھ تک پہنچی جو کیلاش نے مرنے سے دو تین روز پہلے میرے لیے خریدی تھی ــــ شوخ ــــ گہرے سرخ رنگ کی ساڑھی۔ اور اس ساڑھی کو دیکھتے ہی میرے کانوں میں کیلاش کے الفاظ گنگنانے لگے۔

''تم ہمیشہ سوبر Sober قسم کی ساڑھیاں پہنتی ہو ــــ اب کی میں تمہارے لیے گہرے شوخ رنگ کی خوبصورت ساڑھیاں لاؤں گا ــــ''

اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ــــ اب کس کے لیے پہنوں یہ ساڑھی ؟ اور میں نے اس ساڑھی پر سے نظریں ہٹالیں ــــ اور پھر میری ساس نے وہ ساڑھی سنبھال کر رکھ دی ــــ

میں نے بتایا نا کہ میرے سسر جی نے کیلاش کی موت کے تیرھویں ہی دن ،یعنی

جب کریا کرم ہو چکا اور سب لوگ جا چکے، مجھے دوسری شادی کے لیے سمجھانا شروع کر دیا تھا___ انہوں نے اس وقت میرے پاپا سے اپنے دل کی بات کہی تھی یا نہیں، میں نہیں جانتی___ لیکن میرے دیور کے ساتھ میری شادی کر دینے کا سجھاؤ انہی کا تھا___ بھلے ہی میرے سامنے ان کا یہ سجھاؤ میرے پاپا نے رکھا تھا___ اور ممی نے اس کی تائید کی تھی___ اور اس کے بعد سب نے متفقہ طور سے اس سجھاؤ پر اپنی خوشی کا اظہار کر دیا___ میرے اور کیلاش دونوں کے گھر والوں نے۔ سب نے۔ میرے سسر جی نے کہا۔

''ہم تو یہی چاہتے ہیں بیٹی کہ پھر سے یہ گھر تیرے قہقہوں سے آباد ہو جائے___ تو اس گھر میں رہے گی تو ہمارے گھر کی عزت گھر ہی میں رہے گی___''

''لیکن پاپا___ میں کب یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں___؟ میں شادی نہ کر کے بھی تو اسی گھر میں رہ سکتی ہوں___''

''ضرور رہ سکتی ہو___ تمہارا ہی تو گھر ہے___ لیکن یہ زندگی اکیلے کاٹے نہیں کٹتی بیٹی...... شادی تو تمہاری ضرور ہونی چاہئے___ اور اگر نکھل سے ہو جائے تو......''

اور میں خاموش ہو جاتی___

اور پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا___ میں اگر نکھل کے ساتھ شادی کر لیتی ہوں۔ تو یہ میرے لیے بھی اچھا ہے اور بٹو کے لیے بھی___ اور کچھ اسی طرح نکھل نے بھی اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا___

اور آج میری دوسری شادی ہوگئی ہے___ نکھل کے ساتھ___ صرف گھر کے چند لوگوں کے سامنے۔ مختصر رسموں اور اگنی کے گرد سات پھیروں کے درمیان___ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری نند میری ساس کی الماری میں سے ایک ساڑھی نکال کر میرے سامنے رکھ گئی ہے تاکہ میں یہ ساڑھی پہن لوں تو وہ مجھے نکھل کے کمرے تک چھوڑ آئے___ اس سے پہلے میں کئی بار نکھل کے کمرے میں جا چکی ہوں لیکن اس کے ساتھ

شادی ہو جانے کے بعد اب پہلی بار اس کے کمرے میں جانے کے لیے مجھے سہارے کی ضرورت ہے!___ وہ کمرہ جو اب میرا اپنا کمرہ ہو جائے گا!___

میں نے ساڑھی دیکھی تو میں چونک اٹھی۔ یہ وہی ساڑھی تھی جو کیلاش نے خریدی تھی میرے لیے۔ اور اس ساڑھی نے میرے سامنے وہ سب باتیں، وہ سب نظارے لا کھڑے کیے ہیں___ میری نند کو شاید خیال نہیں رہا کہ یہ وہی ساڑھی ہے___ یا شاید اسے اتنی ساڑھیوں میں یہی ساڑھی اچھی لگی ہے___ یہ ساڑھی جو کیلاش کی اپنی پسند تھی!

میں ہاتھ میں ساڑھی لیے اٹھی تو اچانک میری نظریں سنگھار میز کے قد آدم آئینے کی طرف اٹھ گئیں___ اور مجھے اپنا سراپا ساڑھی میں ملبوس نظر آیا___ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کیلاش نے پیچھے سے آ کر میری کمر میں اپنے بازو حمائل کر دئے ہوں___

''ارے ہٹیے بھی___''

''کیوں ہٹوں___ اسی لیے تو لایا تھا یہ ساڑھی___ کہ تم اسے پہنو اور میں تمہیں پیار کروں___ اس ساڑھی میں تم اتنی اچھی لگ رہی ہو۔ اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ......''

''بس بس___'' میں ان کے بازوؤں میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی___ اور___

اُف! کیلاش تھے کہاں___؟ سامنے آئینے میں تو صرف میں کھڑی تھی___ اپنے ہاتھ میں ساڑھی لیے___ اور میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا___ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی___ میں نے وہ ساڑھی رکھ دی___ یہ ساڑھی پہن کر میں نکھل کے کمرے میں نہیں جا سکتی___ یہ ساڑھی میں کبھی نہیں پہن سکتی___ یہ ساڑھی میں کسی کو دے دوں گی اور یہ فیصلہ کر کے میں نے جلد جلد اپنی الماری میں سے دوسری ساڑھی نکال لی اور اسے پہننے لگی۔ جیسے ہی میں نے سامنے دیوار پر لگی کیلاش کی تصویر کی طرف دیکھا تو وہ تصویر مجھے مسکراتی سی نظر آئی___ ایک طنز بھری مسکراہٹ___ میں نے ادھر سے

نظریں ہٹالیں ___ اور آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی ___ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تصویر اب بھی مجھے گھور رہی ہے ___

''بھابھی تیار ہوگئیں ___؟''

''ہوں ___''

''ارے! تم نے وہ ساڑھی نہیں پہنی ___؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی ___

''اچھا۔ یہی ٹھیک ہے ___ چلو تمہیں نکھل کے کمرے تک چھوڑ آؤں ___''

میں نند کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو بھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تصویر مجھے برابر گھورے جا رہی ہو ___ نکھل کا کمرے دو کمرے چھوڑ کر تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دور ہے وہ کمرہ ___ اس کمرے تک جانے کے لیے میرے قدم نہ جانے کیوں اتنے بھاری ہو رہے تھے؟! اور پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ نکھل کے کمرے میں بھی تو کیلاش کی تصویر لگی ہے! کیلاش کی موت کے بعد نکھل نے بھی کیلاش کی تصویر اپنے کمرے میں لگوالی تھی ___ اور اس پر پھولوں کا ہار پہنا دیا تھا ___ نکھل کے کمرے میں لگی اس تصویر کا خیال آتے ہی میرے قدم لڑکھڑا سے گئے ___ میری یہ لڑکھڑاہٹ میرے ساتھ چلتی میری نند نے بھی محسوس کی ___ اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی ___ اس نے کیا سمجھا؟ ___ میں نہیں جانتی ___ میری نظروں کے سامنے نکھل کے کمرے میں لگی تصویر گھوم رہی تھی جو کمرے میں گھستے ہی سامنے نظر آئے گی۔

نکھل کا کمرہ کھلا تھا ___ میری نند مجھے پلنگ پر بٹھا کر چلی گئی ___ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ نکھل کا انتظار کرنے لگی ___ اپنے چاروں طرف بکھرے پھولوں پر نظر ڈالنے کے بعد میں نے آہستہ آہستہ دائیں طرف نظر دوڑائی ___ اس جگہ جہاں کیلاش کی تصویر لگی تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ جگہ خالی تھی۔ وہاں کوئی تصویر نہ تھی۔

اک لڑکی سیدھی سادی سی

نیرج ایک ہندو پنجابی ـــــ اور ڈورتھی کیتھولک کرسچین ۔لیکن محبت مذہب یا قومیت کہاں دیکھتی ہے؟ دونوں ہی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رک سکتے۔ دونوں ہی شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے لیے بے تاب تھے! ڈورتھی نے تو اپنے ماں باپ کو راضی کر لیا تھا لیکن نیرج کی بیوہ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ایک کرسچین بہو لانے پر ہرگز تیار نہ تھی۔ اسے اپنے دھرم بھرشٹ ہو جانے کا اتنا ڈر نہ تھا جتنا یہ وہم تھا کہ اس کے بیٹے کی گرہستی ایک کرسچین لڑکی کے ہاتھوں میں قطعی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ایک الگ قسم کے سنسکاروں میں پلی لڑکی اس کے بیٹے کو سکھی نہیں رکھ سکتی۔ اور نیرج اپنی ماں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کے بارے میں سوچ ہی نہ سکتا تھا! ـــــ یہ بات اس نے ڈورتھی کو بھی اچھی طرح سمجھا دی تھی!

نیرج کی ماں اگرچہ اور لوگوں کے ساتھ اکثر پنجابی ملی ہندوستانی میں بات کرتی۔ لیکن نیرج کے ساتھ وہ ہمیشہ شدھ پنجابی ہی میں بات کرتی تھی۔ اور نیرج بھی ماں کے ساتھ پنجابی میں ہی بات کرتا۔ لیکن اب اس کو دفتر میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہندوستانی میں بات کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی ماں کے ساتھ بھی وہ ایک دو جملے ہندوستانی میں بول دیتا جس کا جواب ماں اسے پنجابی ملی ہندوستانی میں دینے لگتی۔

''اپنے بندے پھر دی اپنے ہوندے ہیں نیرج۔ میں نہیں چاہندی کہ اسی غیراں نال متھالا یئے۔'' وہ نیرج کو سمجھاتی۔ ''اپنے پاسے کی کڑیاں دا کال نہیں پڑ گیا۔ تینوں اپنی طرف دی اک تو اک بڑھ کے کڑی مل سکدی ہے پُتر۔''

''پر ماں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں شادی کروں گا تو اسی سے ورنہ نہیں کروں گا۔'' ماں خاموش ہو جاتی اور بڑی بے چارگی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی جیسے اس نے نیرج کا نہیں، نیرج نے اس کا دل دکھایا ہو!

جب ماں کے پاس نیرج کی کوئی دال نہ گلی تو اس نے ڈورتھی سے اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا۔ لیکن ڈورتھی مایوس نہیں ہوئی۔ اسے امید تھی کہ نیرج کی ماں ایک نہ ایک دن ضرور مان جائے گی۔

ڈورتھی کچھ ہی عرصہ پہلے نیرج کی کمپنی میں جونیئر آفیسر بن کر آئی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات دفتر کے ایک کام کے سلسلے میں ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے لیے کشش سی محسوس کی۔ اور پھر کام کے سلسلہ میں انہیں کئی بار ملنا پڑا اور ہر ملاقات میں وہ ایک دوسرے کے نزدیک آتے چلے گئے۔

نیرج نے ڈورتھی کو اپنی ماں کے خیالات کے بارے میں اس وقت بتایا جب ان کی محبت شدت اختیار کر چکی تھی۔ اور ڈورتھی کے لیے اب کسی بھی طرح یہ ممکن نہ تھا وہ محبت کے راستے پر اتنی دور آ جانے کے بعد واپس مُڑے۔

''دیکھو نیرج۔ جب تک مجھے تمہارے پیار میں کمی محسوس نہیں ہوتی میں امید کا دامن چھوڑنے والی نہیں۔ امید ہی نہیں مجھے تو یقین ہے کہ ماں جی کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔''

''لیکن کیسے ____؟ جب وہ تمہیں اپنے نزدیک آنے دیں گی جب نا ____''

اور ڈورتھی سوچ میں پڑ جاتی۔ لیکن اس سوچ میں چنتا کا پہلو کم ہوتا نیرج کی ماں کو

جیتنے کی کوئی ترکیب سوچنے کا عنصر زیادہ۔

نیرج نے ماں کو شروع شروع میں ڈورتھی کی ایک تصویر دکھائی تھی جس میں ڈورتھی ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور تصویر میں کسی بھی طرح کرسچین نظر نہیں آتی تھی۔ ماں کے چہرے پر پسندیدگی کے آثار دیکھ کر نیرج نے ہمت کر ہی ڈالی۔

''کیوں ماں۔ تمہیں یہ لڑکی پسند ہے؟''

''ہاں اچھی اے۔۔۔ بہت اچھی اے۔۔۔'' ماں نے تصویر پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''نام بھی تو بہت اچھا ہے اس کا۔۔۔''

نیرج نے سوچا ماں کو پتہ چل ہی جائے تو اچھا ہے۔

''کی ناں ہے اس دا۔۔۔؟''

''ڈورتھی۔۔۔''

نیرج کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن وہ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ڈورتھی!۔۔۔ اے کی ناں ہوئیا؟''

''اے لو۔۔۔ ڈورتھی نام ہی کیا ہوا۔۔۔ واہ ماں!۔۔۔ جس طرح رما، بملا، رضیہ، سلمہ، نیرجا، نرملا اسی طرح ڈورتھی۔۔۔''

ماں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ نیرج کیا کہنا چاہتا ہے۔۔۔؟ ماں کی اس بوکھلاہٹ کو دیکھ کر نیرج کو بڑے زور سے ہنسی آئی۔ لیکن ماں کی جیسے چھٹی حس جاگ پڑی۔

''اے لوگ کون ہوندے ہیں۔؟''

نیرج اپنے آپ کو اس سوال کے لیے تیار کر چکا تھا۔

''ماں ۔ وہ لوگ کرسچین ہیں ۔ بہت اچھے لوگ ہیں ۔''

ماں کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے جھٹ تصویر پرے ہٹا دی۔ اور پھر ہاتھ سے نیرج کو اپنے سے دور کرتے ہوئے بولی۔

''چل ہٹ پرے۔'' اس کی آواز میں غصہ اور جھلاہٹ تھی۔

نیرج کھسیانا سا ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

اور اس کے بعد اس نے دو تین بار ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ماں نہ مانی۔ الٹا وہ نیرج کو سمجھانے لگی۔

جب نیرج نے ڈورتھی کے سامنے اپنی مایوسی کا اظہار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ــــــ ڈورتھی اس کے دل کی حالت جان گئی۔ اس نے اس کی ڈھارس بندھائی اور خود اس مہم کو سر کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

سب سے پہلے اس نے چپراسی کے ہاتھ نیرج کی ماں کو تصویروں کا ایک پیکٹ بھیجا۔ نیرج کے ساتھ کھینچی ہوئی اپنی تصویریں ــــــ ہر تصویر ان کے پیار کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ ان تصویروں کو دیکھ کر کوئی بھی اس جوڑی پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ نیرج کی ماں نے جب لفافے پر بھیجنے والے کا نام پڑھا تو وہ لفافہ اسی طرح چپراسی کے ہاتھ واپس کر دیا۔ کسی قسم کا سندیسہ دیئے بغیر۔

اور کچھ دن بعد ڈورتھی نے تصویروں کا وہ پیکٹ بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا۔ جسے نیرج نے وصول کر لیا اور پھر ماں کو دے دیا۔ ماں نے تصویروں کا وہ پیکٹ کھولا ضرور لیکن ان تصویروں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد انہیں اسی طرح پھر بند کر کے پیکٹ ایک طرف کر دیا۔ نیرج کی زبانی ڈورتھی کو ماں کی اس بے تعلقی کا پتہ چل گیا۔ لیکن ڈورتھی مایوس نہیں ہوئی۔

دیوالی کا تہوار آیا تو اس نے چپراسی کے ہاتھ ماں جی کو اپنے ہاتھ کا بنا ہوا اون کا

بلاؤز بھجوادیا اور اس پر ایک خوب صورت چٹ لگائی ''دیوالی مبارک'' ماں جی نے چپراسی سے وہ پیکٹ لے لیا۔ دل تو ان کا چاہا کہ وہ اسی طرح پیکٹ واپس کردیں لیکن پھر ایک انجان جذبے کے تحت وہ پیکٹ انہوں نے رکھ لیا۔ پیکٹ کو انہوں نے اکیلے میں کھولا بلاؤز کو پہلے سرسری طور پر اور پھر اشتیاق بھری نگاؤں سے دیکھا۔ پھر اسے سینے پر جما کر اس کی پھبت کا اندازہ لیا۔ اور پھر فوراً اسے اسی طرح تہہ کر کے پیکٹ بنایا اور اس پر وہی چٹ لگادی اور جب نیرج آیا تو بولیں۔

''ارے کیسی بے شرم لڑکی ہے۔ یہ لے۔ اسے واپس بھجوادینا''۔ اور انہوں نے پیکٹ نیرج کو تھمادیا۔ ''اونوں سمجھائیں ایہہ حرکتاں چھوڑ دے۔''

نیرج نے دوسرے دن خود جا کر وہ بلاؤز ڈورتھی کو واپس کردیا۔

''بےکار ایسا کرتی ہو۔ میری ماں تو پتھر دل ہوگئی ہے۔ سچ ڈورتھی!۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ماں اتنی سخت دل ہے۔''

ڈورتھی نے نیرج کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اس کی طرف دیکھ کر مسکرادی جیسے کہنا چاہتی ہو۔ میں جانتی تھی کہ ماں اسے واپس کردیں گی۔

نیرج کو بہت افسوس ہوتا یہ سوچ کر کہ اس نے ماں جی کو ڈورتھی کے بارے میں بتا کر جلد بازی سے کام لیا ہے۔ پہلے وہ ڈورتھی کو ماں جی سے ملاتا۔ پھر کتنی کتنی دیر کے لیے اس کو ان کے پاس اکیلے چھوڑ دیتا اور جب وہ ان کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالیتی تو پھر موقع دیکھ کر اُنہیں بتا دیتا کہ وہ ایک کرسچین لڑکی ہے۔ اس وقت ان کے دل میں ڈورتھی کے لیے ایک انسیت بھی پیدا ہو چکی ہوتی جو دوسرے سب جذبوں پر سب اندیشوں پر غالب آجاتی۔ لیکن اس نے جلد بازی سے کام لیا اور اب پچھتانا پڑ رہا ہے۔

وہ دیکھتا۔ ڈورتھی ذرا بھی بد دِل نہ تھی۔ اب بھی باقاعدہ ماں جی کے دل میں اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دیوالی کے بعد کرسمس آیا تو اس نے ماں جی کی پسند

جان کران کے لیے ایک ڈبہ ملک کیک کا خریدا اور ڈبے پر ماں جی اور نیرج کو''ہیپی کرسمس'' لکھا اور ڈبہ نیرج کو دے دیا۔ نیرج نے اس میں سے تھوڑی سی مٹھائی ماں جی کو کھلا دی اور پھر انہیں بتایا کہ یہ مٹھائی ڈورتھی نے بھجوائی ہے۔ ماں جی نے بڑے شوق سے مٹھائی کھائی تھی لیکن پتہ چلنے پر انہوں نے وہ مٹھائی منہ بھی نہ لگائی۔

نیرج نے کہا بھی۔''آخر آپ کو یہ مٹھائی کھانے میں کیا اعتراض ہے۔ یہ تو اس نے بازار سے خریدی ہے۔ اس کے ہاتھ کی بھی نہیں بنی ہوئی۔ آپ ناپاک نہیں ہو جائیں گی۔''

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر۔؟''

''بس۔ میرا دل نہیں چاہتا۔''

نیرج نے باتوں باتوں میں ڈورتھی کو یہ سب بھی بتا دیا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ نیرج اور ڈورتھی اب بھی اسی طرح ملتے تھے بلکہ وہ اور بھی ایک دوسرے کے نزدیک ہو گئے تھے۔ بھلے ہی نیرج کو ماں جی کے جیتے جی ڈورتھی سے شادی کر پانے کی کوئی امید نہ تھی!

نیا سال آیا تو ڈورتھی نے ماں جی اور نیرج کو بھیجنے کے لیے ایک خوبصورت سا کارڈ خریدا۔ اس پر ان دونوں کے نام لکھنے لگی تو اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اس کارڈ کو پنجابی میں کیوں نہ لکھے؟! اور اس نے نیرج سے کارڈ پر لکھنے کے لیے مناسب الفاظ کا پنجابی میں ترجمہ پوچھا اور انہیں ہندی میں لکھ لیا۔ اور جب ماں جی کو کارڈ ملا تو اس پر لکھا تھا۔

''نیرج تے ماں جی نوں

ڈورتھی ولوں''

اور ان الفاظ کو پڑھ کر ماں جی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ لیکن اس

مسکراہٹ میں تمسخر زیادہ تھا۔ ''واہ نی کڑیے۔ بڑی تیج ہیں توں۔''

اور پھر ڈورتھی نیرج سے کئی الفاظ کے پنجابی پوچھنے لگی۔ ساتھ میں پنجابی تلفظ اور لہجہ بھی۔

نیرج ہنس کر کہتا۔

''تو کیا اب تم پنجابی سیکھنا چاہ رہی ہو۔؟

''ہاں۔''

''اچھا! یعنی تمہیں اب بھی امید ہے؟''

''جی۔امید نہیں یقین۔ اور پھر زبان سیکھنے میں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' اور وہ برابر پنجابی سیکھتی رہی۔

اور پھر اس نے ماں جی کو ایک خط لکھا اس خط میں کئی الفاظ پنجابی کے تھے۔ اس نے لکھا۔

ماں جی!

پرنام ۔آپ کو میرا یہ خط پا کر حیرت تو ضرور ہوگی۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی آپ کو خط لکھنے کی۔ پر پھر جھجک سی محسوس ہونے لگتی۔ لیکن اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں اپنے دفتر کا امتحان دینے جا رہی ہوں۔ تیاری تو میں نے پوری کر لی ہے اگر تہاڈی آشیرواد مل جائے تو ضرور کامیابی ہوگی۔ تہاڈی آشیرواد دی مینوں بہت ضرورت ہے۔ میں ایہہ خط بھیج کے تہاڈی آشیرواد مانگ رہی ہوں۔

آپ کی
ڈورتھی

ماں جی نے وہ خط پڑھا ضرو لیکن جواب نہیں دیا۔ اور ڈورتھی کو جواب کی امید بھی نہ تھی! تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے ماں جی کو دوسرا خط لکھا۔ اس میں بھی بہت سے الفاظ پنجابی کے تھے۔ ماں جی نے اس خط کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

نیرج کا خیال تھا کہ اتنی بے عزتی ہو جانے کے بعد ڈورتھی اپنا ارادہ بدل دے گی۔ لیکن اس نے دیکھا ڈورتھی ابھی تک اپنے ارادے پر قائم تھی۔ وہ کئی بار ڈورتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل کی حالت جاننے کی کوشش کرتا اور اسے محسوس ہوتا ڈورتھی ذرا بھی مایوس نہ تھی!

اور پھر ایک روز ماں جی کو بخار آ گیا۔ ڈورتھی کو پتہ چلا تو اس نے ماں جی کو پھر ایک خط لکھ دیا۔

''ماں جی!۔ نیرج سے پتہ چلا کہ تہاڈی طبیعت خراب ہے۔ رب توانوں جلد توں جلد ٹھیک کرے!۔ اپنی صحت دا خیال رکھیا کرو ماں جی۔ ایشور کرے تسی جلدی ٹھیک ہو جاؤ!۔ میری تاں ہر ویلے ایہوہی دعا ہے کہ نیرج پر آپ کا سایہ ایک لمبے عرصے تک بنا رہے! میرے لائق کوئی سیوا ہووے تو ضرور دَسنا۔

تہاڈی اپنی
ڈورتھی

ماں جی نے وہ خط اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

کافی دن لگ گئے ان کے ٹھیک ہونے میں۔ اور اس دوران ڈورتھی نے ایک چھوٹا سا خط انہیں اور لکھ دیا۔ اور ماں جی نے وہ خط بھی اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

اور اب ماں جی ٹھیک ہو چکی تھیں۔

اور دو روز بعد ماں جی کا جنم دن تھا۔

جنم دن والے روز ماں جی نے سوجی کا حلوہ بنایا۔ اور دونوں ماں بیٹے نے ہَون کیا۔ وہ لوگ مکان کے آگے بنے چھوٹے سے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اچانک بھاٹک کھلا اور ماں جی نے دیکھا ایک لڑکی اندر داخل ہوئی ہے۔

نیرج کے منہ سے حیرت بھرے لہجے میں نکلا۔'' ارے !ڈورتھی!؟۔ یہ یہاں کیسے۔؟!'' اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ ماں جی نے بھی ڈورتھی کو پہچان لیا۔ تصویروں میں دیکھی شکل کو وہ بھول نہ پائی تھیں۔

اندر آنے کے بعد ڈورتھی جلدی سے آگے بڑھی اور ماں جی کے پاؤں چھو لیے۔ اور پھر عقیدت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

توانوں جنم دن مبارک ہووے ماں جی۔''

ماں جی ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئیں۔ اور پھر اٹھ کر انہوں نے ڈورتھی کو گلے سے لگا لیا۔ اور ان کے منہ سے جیسے آپ ہی آپ نکل گیا۔

''جیتی رہو بیٹی۔ پر ہیں تو بڑی ضِدّی''

ڈر

شہر سے باہر سڑک کے دونوں جانب ایک چھوٹی سی کالونی آزادنگر آباد ہے۔ایک طرف آزادنگر سیکٹر اے اور دوسری جانب آزادنگر سیکٹر بی۔ان دونوں سیکٹروں میں دو مذہبوں کے لوگ کچھ اس طرح بس گئے ہیں کہ سیکٹر اے میں تقریباً ستّر فی صد ایک مذہب کے ہیں اور تیس فی صد دوسرے مذہب کے تو سیکٹر بی میں یہ تناسب الٹا ہوگیا ہے۔ایک مذہب کی عبادت گاہ آزادنگر اے میں ہے اور دوسرے مذہب کی عبادت گاہ سیکٹر بی میں۔ ان عبادت گاہوں میں دونوں سیکٹروں کے لوگ اپنے اپنے مذہبی تیوہاروں پر اکٹھا ہوتے ہیں دونوں سیکٹروں کے باشندوں میں کافی دوستانہ اور بھائی چارہ ہے۔کچھ خاندان تو ایسے ہیں جو اس کالونی میں بسنے سے پہلے بھی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اب تو یہ کالونی دس برس سے بھی زیادہ پرانی ہوگئی ہے۔ایک ہی کالونائزر نے دونوں سیکٹر بنائے تھے لیکن ایک پہلے بنا تھا اور دوسرا ایک ڈیڑھ برس کے بعد۔کالونائزر خود اس مذہب سے تعلق رکھتا تھا جس مذہب کے سیکٹر اے میں تیس فی صد لوگ تھے۔اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سیکٹر بی میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو بسادے۔کمرشیل طور پر تو یہ ممکن نہ تھا۔لیکن اس نے درپردہ اپنے مذہب والوں کو پلاٹ بیچتے وقت آسان قسطوں میں قیمت ادا کرنے کی سہولت مہیا کردی۔اس طرح سیکٹر بی

میں اس کے ہم مذہب اکثریت میں ہو گئے!

میرا اپنا مکان سیکٹر اے میں ہے۔ لیکن میرے دوست دونوں سیکٹروں میں آباد ہیں اور ان دوستوں میں دونوں مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔

اچانک شہر میں فساد پھوٹ پڑا۔ دونوں مذاہب کے کٹر پنتھیوں اور جنونیوں نے ایک دوسرے کے مذہب کے خلاف زہر اگلا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی بھی مذہب دوسرے مذہب والوں سے نفرت کرنا یا دوسرے مذہب پر نکتہ چینی کرنا نہیں سکھاتا۔ غنڈا ایلمینٹ تو ہمیشہ ایسے ہی وقت کے انتظار میں رہتا ہے۔ ان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ سب مذہب کے غنڈوں میں فساد کے دنوں میں دوستی بڑھ جاتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ میں برابر کا حصہ بانٹنے کے لیے۔

آزادنگر کے ان سیکٹروں میں زیادہ تر ریٹائرڈ لوگ آباد ہیں اور یا پھر نوکری پیشہ۔ کچھ چھوٹے بڑے بزنس مین بھی ہیں۔ جنہوں نے ان سیکٹروں میں دکانیں یا اپنے دفتر کھول رکھے ہیں۔ تقریباً سبھی باشندے تعلیم یافتہ ہیں۔ مذہب کو جینے کا طریقہ یا سلیقہ ماننے والے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے دکھ درد کو کم کرنے والے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہو کر ان کی خوشیوں کو بڑھانے والے، امن پسند شہری! لیکن یہ امن پسند شہری، شہر میں فساد کی خبر سن کر ڈر گئے ہیں۔ شہر کے کئی علاقوں میں کرفیو لگا ہوا ہے لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں کسی نے کسی طرح اکادکا وارداتیں اب بھی ہو رہی ہیں۔ آزادنگر میں بنی چار پانچ منزلہ عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ کر جب کچھ لوگ شام کو شہر کے مختلف علاقوں میں سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں۔

''ارے پاپا۔ وہاں تو ایک بہت بڑا جنرل اسٹور ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس میں آگ لگادی گئی ہے۔ پاپا! اس اسٹور میں تقریباً پچاس آدمی کام کرتے ہیں اور ان میں تقریباً ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ ان سب کی تو روٹی روزی ختم ہوگئی۔ اسٹور کا مالک

اب انہیں ملازمت میں کیسے رکھ پائے گا؟''

میرا لڑکا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے مکان سے ذرا فاصلے پر بنی پانچ منزلہ عمارت پر شہر کے حالات دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ اس نے یہ خبر دی تو میرا دل دہل گیا۔ میں اس اسٹور سے اکثر سامان لیتا ہوں۔ اس کا مالک بہت نیک آدمی ہے۔ مجھے آج تک یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ وہ کون سے مذہب کا ہے۔ کیوں کہ اس کا لباس، اس کی بول چال، اس کی عادات و خصائل کسی بھی مذہب کا اشتہار نہیں ہیں۔ قرآن اس نے پڑھ رکھا ہے۔ گیتا وہ جانتا ہے۔ گورو گرنتھ صاحب اور بائبل کا مطالعہ اس نے کر رکھا ہے۔ وہ ان سب کتابوں میں سے کوٹیشن سنایا کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہ خیالات اسے بہت مہنگے پڑے۔ فسادیوں نے اسی کے اسٹور کو جلا دیا۔

شہر کے فساد کا آزاد نگر کالونی پر بھی اثر پڑا۔ دونوں سیکٹروں میں اقلیت کے لوگ اپنے ڈر کا اظہار کرنے کے لیے اپنے ہم مذہب گھروں میں اکٹھا ہونے لگے ــــــــ

ڈر!۔ افواہیں !!۔ افواہیں!۔ ڈر!!

دونوں سیکٹروں میں امن کمیٹیاں بن گئیں، جن میں دونوں مذاہب کے لوگ شامل تھے اور جن کے ممبران کا کام اقلیت کے باشندوں کو حوصلہ دینا تھا گھر گھر جا کر امن کا پرچار کرنا تھا؛ لیکن اسی دوران شہر کے کچھ افراد آئے اور کچھ گھروں میں چوری چھپے ان کے خود کے تحفظ کے لیے طرح طرح کے ہتھیار دے گئے۔ ایسے ہتھیار جو قانوناً بغیر لائسنس کے نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اور پھر ایک روز انہوں نے دیکھا کہ ان میں سے کئی گھروں کے دروازوں پر سفید چاک سے نشان لگے ہیں۔ دونوں سیکٹروں میں جو تیس پینتیس فیصد دوسرے مذہب کے تھے صرف انہیں کے دروازوں پر۔ بلکہ زیادہ تر ان گھروں کے دروازوں پر جو کسی گلی یا بلاک میں اکا دکا تھے۔ سیکٹر اے میں کراس (✕) کے نشان تھے اور سیکٹر بی میں ٹک مارک (✓) یعنی ''صحیح'' کے نشان۔

''کرنل صاحب ! آپ کے مکان کے باہر چاک سے نشان نہیں لگا ہے لیکن میرے مکان کے باہر یہ نشان کیوں لگا ہوا ہے۔اور اسی طرح ہماری کمیونٹی کے کئی گھروں کے باہر نشانات لگے ہوئے ہیں۔''

اپنے پڑوسی پروفیسر صاحب کی بات سن کر مجھے تشویش ہوئی۔ پڑوسی بننے سے پہلے ہم دونوں دوست بھی تھے۔ ہم دونوں کے مکانوں کی دیوار ساجھی ہے۔دس مکانوں کی اس قطار میں صرف پروفیسر صاحب ہی دوسرے مذہب کے تھے،لیکن انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا تھا شہر میں جب فساد پھوٹ پڑا تو شروع میں انہوں نے کوئی ڈر محسوس نہیں کیا لیکن جب شہر کی فضا کو بگڑے ہوئے سات آٹھ دن ہونے کو آئے اور طرح طرح کی افواہوں نے زور پکڑا اور دونوں مذاہب کی عبادت گاہوں میں بجائے دعائیں مانگنے کے،ایک دوسرے کے مذہب کے خلاف باتیں ہونے لگیں تو پروفیسر اور اس کے گھر والے ڈر اور شک میں مبتلا ہونے لگے اور یہ ڈر اور شک اس روز تو انتہا کو پہنچ گیا جب انہوں نے اپنے پھاٹک کے باہر دیوار پر سفید کراس کا نشان دیکھا۔تب انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ آس پاس ان کے کئی ہم مذہب گھروں کے باہر ایسے نشان لگ گئے تھے۔ میں نے ان کی فکر کو دور کرنے کی کوشش کی ——

''پروفیسر صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ جنہوں نے بھی یہ نشان لگائے ہیں ہم ان کی اسکیم کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ ہماری امن کمیٹی نے حکام کو بھی لکھ دیا ہے اور کمیٹی کے ممبران نے رات کو مل کر پہرہ بھی دینا شروع کر دیا ہے۔''

پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر فکر کے آثار برقرار تھے۔

آج ایک ہفتہ مزید گزر جانے کے بعد شہر کے حالات تقریباً نارمل ہو گئے ہیں لیکن آزاد نگر کے دونوں سیکٹروں میں نشان زدہ گھروں میں تناؤ برقرار ہے۔ ان لوگوں نے

نشان تو مٹا دیئے تھے لیکن اس نشان دہی کی وجہ سے جو نشان ان کے دلوں میں پڑ گئے ہیں وہ ابھی تک نہیں مٹ سکے ـــــ وہ لوگ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے ـــــ ان میں سے کئی تو اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنے مکان بیچ کر کہیں اور چلے جائیں۔

''پروفیسر صاحب! آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟ کیوں یہ مکان بیچ کر سامنے والے سیکٹر میں جانا چاہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ تو لیا شہر کی مکدّر فضا کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا ہماری کالونی پر۔ یہ سب افواہیں پھیلانے والوں کی بدمعاشی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ پر ایک ڈر تو بنا ہوا ہے نا؟''

''یعنی آپ کو اس دوست پر بھروسہ نہیں ہے۔ اور آپ یہ بھی بھول گئے کہ میں ایک ریٹائرڈ کرنل ہوں۔''

''ارے نہیں ـــــ یہ بات نہیں، ہمیں آپ پر بھروسہ ہے اور پورا بھروسہ ہے لیکن ہم آپ کو خطرے میں کیوں ڈالیں۔؟''

اس وقت ہم دونوں ہمارے گھر کے برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ پروفیسر نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل اس وقت ایک اچھا مکان سامنے والے سیکٹر میں مناسب قیمت پر مل رہا ہے۔ اگر آج ہی ایڈوانس دے کر سودا نہ کیا تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

پروفیسر کی بات سن کر میرا من اداس ہو گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا بلکہ ہم دونوں نے سوچ رکھا تھا کہ زندگی بھر کا ساتھ رہے گا۔ اور اب پروفیسر صاحب دوسری جگہ جا کر بسنے کی سوچ رہے تھے! مجھے اداس دیکھ کر وہ بولے:

''ارے یار! میں دور تھوڑی جا رہا ہوں۔ سڑک کے پار سامنے والے سیکٹر ہی میں تو جا رہا ہوں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے اپنی اداسی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اسی وقت کال

بیل بج اٹھی۔ ہم دونوں نے سامنے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ ہمیں ایک سیلز گرل کھڑی نظر آئی۔ کندھے پر ایک بڑا سا جھولا لٹکائے۔ میں اٹھ کر پھاٹک کے پاس آ گیا۔

''آپ کے گھر میں کوئی لیڈیز ہیں؟''

''نہیں۔ اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔''

''ان کے مطلب کی چیزیں ہیں ہمارے پاس۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو آپ بھی ان کے لیے خرید سکتے ہیں۔''

امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے جھولے میں سے ایک ڈبہ نکالا —— ''ہماری کمپنی ماتھے پر لگانے والی بندیاں بناتی ہے۔ طرح طرح کی بندیاں۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی وائف کے لیے خرید سکتے ہیں۔''

اس سیلز گرل نے جھولا کندھے سے اتار دیا۔ جلدی سے قریب رکھی ہوئی میز گھسیٹی اور ہاتھ میں لیے ہوئے ڈبہ کو کھول کر اس میں سے بندیوں کے پتّے نکال کر میز پر سجا دیئے۔ طرح طرح کے رنگوں کی، کئی قسم کی شکلوں کی بندیاں جگمگا رہی تھیں۔ گول، چوکور، تکونی، ستارے کی شکل کی۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے سنپولے کی شکل کی بھی۔ پروفیسر بھی برآمدے میں سے اٹھ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا اور بڑے اشتیاق سے بندیاں دیکھ رہا تھا ہر ساری سے میچ کرنے والے رنگ! ایسا لگتا تھا جیسے ان بندیوں نے بندیوں کے رنگوں نے اس کے من پر سے خوف دور کر دیا ہو۔ سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔!

''دیکھئے محترمہ! آپ کے پاس بندیاں تو بے شک لاجواب ہیں۔ لیکن یہ چیز میں نے اپنی وائف کے لیے کبھی نہیں خریدی —— یہ تو وہی خریدے گی۔ وہ ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔ آپ ایسا کیجئے۔ کسی سنڈے یا چھٹی کے دن آجایئے۔ وہ ضرور خرید لے گی۔ وہ کئی قسم کی، کئی رنگوں کی بندیاں رکھتی ہیں اپنے پاس۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم اتوار کو آجائیں گے۔ یا کوئی بھی میری ساتھی آجائے گی۔''

اس نے جھولا کندھے پر لٹکایا اور گیٹ سے باہر نکلی۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے اپنی جیب میں سے ایک سفید چاک نکالی اور گیٹ کے باہر دیوار پر ٹک مارک یعنی صحیح کا نشان لگا دیا۔

میرے دماغ میں جیسے بجلی سی کوندگئی۔

''سنیے! یہ آپ نے نشان کیوں لگا دیا؟''

''اس لیے کہ یہاں ہمارا مال بکنے کی امید ہے۔کل کو میں نہ آسکوں تو ہماری کمپنی کی دوسری سیلزگرل اس نشان کی مدد سے اس مکان تک پہنچ جائے گی۔''

''اور اگر مال بکنے کی امید نہ ہوتی تو؟''

''تو ہم کراس کا نشان لگا دیتے۔''

''ارے تو یہ ساتھ والے ان پروفیسر صاحب کے مکان پر کراس کا نشان آپ ہی لوگوں نے لگایا ہے؟''

''جی ـــــ جی ہاں! ہماری کمپنی کی سروے ٹیم نے یہ نشان لگائے ہیں۔ بندی سہاگ کی نشانی ہے۔لیکن ہر مذہب میں نہیں ہے نا۔''

وہ چلی گئی تو پروفیسر میرے ساتھ پھر برآمدے میں آبیٹھا ـــــ سوچتا ہوا۔ مسکراتا ہوا۔

اور برف پگھل گئی

میرٹھ سے ستر کلو میٹر دور، گرینڈ ٹرنک روڈ کے میرٹھ آگرہ سیکشن میں جو بس ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی اس میں مسز جھوما نارائن بھی تھی اور وہ بھی اسی حادثے میں زخمی ہوئی تھی۔ بظاہر اس کے جسم پر تین ہی چار زخم تھے جو زیادہ گہرے نہ تھے لیکن وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے ہوش تھی جب دوسرے زخمیوں کے ساتھ اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کے پیٹ کے نیچے کا دھڑ بالکل بے حس ہوگیا ہے! اس کے پاؤں اور ٹانگوں میں کہیں بھی چٹکی بھرنے سے اسے کچھ پتہ نہ چلتا۔ وہ نہ کھڑی ہو سکتی، نہ بیٹھ سکتی اور نہ اپنے آپ کروٹ بدل سکتی۔ ڈاکٹروں نے پہلے تو تشخیص کی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کہیں چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے اس کے نیچے کا دھڑ پیرالائیزڈ (Paralysed) ہوگیا ہے۔ لیکن جب ایکس رے اور سکریننگ میں کہیں بھی کسی چوٹ کا پتہ نہ چلا تو ڈاکٹروں کو اپنی رائے بدلنا پڑی۔ اب ان کا خیال تھا۔ جھوما کے دماغ پر اس حادثے کی دہشت بیٹھ گئی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اس کا نیچے کا دھڑ بے حس ہوگیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود بخود نارمل حالت میں آجائے گی۔

لیکن آج اس حادثے کو دو ماہ ہو رہے ہیں اور جھوما اسی طرح پیرالائیزڈ ہے!

جھوما کے ساتھ شادی کے ایک ہفتہ کے بعد دنیش نارائن اپنی ڈیوٹی پر میرٹھ واپس آ گیا اور جھوما کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا آیا۔ تین چار ماہ تک وہ دفتر کے بعد اپنا سارا وقت جھوما کے ساتھ ہی گزارتا رہا۔ اسے اکیلا پن محسوس نہ ہونے دیتا۔ لیکن پھر اسے دفتر میں دیر ہونے لگی اور ساتھ ہی اس نے اپنے دورے کا پروگرام بھی شروع کر دیا۔ اس کا دورہ ایک یا دو دن سے زیادہ کا نہ ہوتا تھا اور اپنی غیر حاضری میں جھوما کے پاس رہنے کے لیے اس نے ایک نوکرانی کا انتظام بھی کر دیا تھا لیکن جھوما اس تھوڑے سے عرصے میں بھی گھبرا جاتی۔ دنیش کا دورہ زیادہ تر آگرہ اور اس کے گردونواح کا رہتا۔ اور اس طرح آگرہ میں وہ اپنے والدین سے بھی مل لیتا پہلے آگرہ کی طرف دورہ کرتے وقت وہ جھوما کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتا اور اسے آگرہ میں چھوڑ کر آس پاس کے علاقے کا دورہ کر آتا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ بہت مہنگا پڑتا تھا۔ اس لیے اب اس کے دورے کے دنوں میں جھوما کو اکیلے ہی رہنا پڑتا۔

دنیش کا تقریباً ہر روز دیر سے گھر آنا اور پھر ہر ہفتے دو دو تین تین دن کے لیے دورے پر چلے جانا۔ یہ سب جھوما کی بے چینی کا باعث بن گیا۔ اسے وہم ہونے لگا کہ دنیش کا دل اب اس سے بھر گیا ہے اور اب وہ اسے محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اب وہ اسے دل سے نہیں چاہتا۔ اس وہم کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دنیش نارائن جس ریڈی میڈ گارمنٹس (Readymade Garments) کی کمپنی میں کام کرتا تھا اس میں اچھی خاصی تعداد سیلز گرلز (Sales Girls) کی تھی۔ اور ان سب کا انچارج دنیش نارائن ہی تھا۔ یہ لڑکیاں اکثر کام کے سلسلہ میں اس کے گھر بھی آ جاتی تھیں اور ان میں کئی لڑکیاں تو جھوما سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ انہیں دیکھ کر جھوما کے دل میں حسد کے ساتھ ساتھ ایک خوف بھی سر ابھارنے لگتا۔

جھوما کے اس وہم اور اس خوف کا پہلا ردعمل تو یہ ہوا کہ وہ دنیش کے اپنے والدین

کی طرف اس کے فطری جھکاؤ کو بھی رقابت کی نظر سے دیکھنے لگی۔ جب کبھی دنیش آگرہ کی طرف دورے پر جاتا اسے جلن سی ہونے لگتی اور اگر کبھی وہ وہاں ایک آدھ دن زیادہ رک جاتا تو وہ اپنے ساس سسر کو کوسنے لگتی۔ وہ بھی شاید نہیں چاہتے کہ ان کا بیٹا اسی کا ہو کے رہ جائے دورے کے علاوہ بھی اسے آگرہ بلاتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کے باپ کی آنکھ کا آپریشن ہے تو کبھی اس کی ماں بیمار ہے۔ شادی کے بعد بھی اسے اپنے ماں باپ، بہن بھائی کی اتنی ہی پرواہ ہے جتنی شادی سے پہلے تھی اور اس کی پروا تو دنیش نے شادی کے تین ہی چار ماہ کے بعد سے کرنا چھوڑ دی ہے!

اور جھوما اس وقت بھی بہت دکھی تھی۔ جب اس نے وہ منحوس بس پکڑی تھی۔

دنیش نارائن حسب معمول آگرہ کی طرف دورے پر گیا ہوا تھا۔ آگرہ میں اس کے چھوٹے بھائی کی سگائی کی بات چل رہی تھی۔ جاتے ہوئے وہ جھوما سے کہہ گیا تھا۔

''گریش کی منگنی کی بات اگر سرے چڑھی تو تمہیں ٹیلیفون سے اطلاع دوں گا۔ تم میرٹھ سے بس میں بیٹھ کر چلی آنا۔ تمہاری موجودگی بہت ضروری ہوگی۔ بڑی بہو ہو۔ تمہارے بغیر رنگ سیرے منی (Ring Ceremony) اچھی نہ لگے گی۔''

جھوما نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف منہ پھلا لیا۔

اور دنیش نے آگرہ پہنچ کر دفتر میں ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست بھجوادی اور جھوما کو ٹیلیفون کروادیا کہ وہ آگرہ چلی آئے۔

جب وہ بس میں سوار ہوئی تھی تو وہ دنیش کے ساتھ گزارے ہوئے پچھلے دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھی —— پہلے دو تین ماہ دفتر کے بعد اس کا ہر وقت کا ساتھ، پھر دفتر سے اس کا دیر سے گھر آنا اور چھٹی کے دن بھی کام کے سلسلہ میں گھر سے باہر چلے جانا اور ہر ہفتے دو دو تین تین دن کے لیے دورے پر چلے جانا۔ جب پہلی بار اسے پتہ چلا تھا کہ دنیش کی کمپنی میں لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں اور ان سب کا انچارج دنیش ہی ہے تو

اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔ وہ سارا دن اداس رہی تھی۔ اس رات دنیش کی محبت کا جواب وہ گرم جوشی سے نہ دے سکی تھی۔ جب اسے پیار کرتے وقت وہ اچانک سرد ہوگئی تو دنیش جھنجلا اٹھا تھا۔ لیکن اسے اس کی یہ جھنجلاہٹ دیکھ کر راحت سی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے اس نے دنیش سے انتقام لے لیا ہو! جب دنیش نے اکتا کر کروٹ بدل لی۔ تو بھی اسے خوشی محسوس ہوئی۔ دنیش تو سو گیا لیکن وہ دیر تک جاگتی رہی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ ہوسکتا ہے یہ اس کا محض وہم ہو۔ دنیش پر کمپنی کی کسی بھی لڑکی کا کوئی بھی اثر نہ ہو۔ کام کے سلسلہ میں اگر اس کا ان لڑکیوں سے واسطہ پڑتا ہے تو یہ ضروری تو نہیں کہ وہ ان سے متاثر بھی ہو جائے۔ دنیش اسے کتنا پیار کرتا ہے! وہ اس پر شک کر کے صرف اپنی کم ظرفی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس کا دل چاہا وہ دنیش کو اپنی طرف کھینچ کر بے اختیار پیار کرلے! لیکن وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو ان وہموں سے آزاد رکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ ہی دن بعد جب اس نے دنیش کی کمپنی کی ایک لڑکی کو اپنے گھر میں دیکھا تو اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ وہ لڑکی دفتر کے کام کے سلسلہ میں، دنیش ہی کے بلانے پر، چھٹی کے دن اس سے گھر ملنے آئی تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی وہ لڑکی۔ دنیش نے اس سے اس کا تعارف بھی کرا دیا۔ ہر بات میں وہ دنیش کو "سر" کہہ کر مخاطب کرتی۔ مٹھاس اور عقیدت بھرے لہجے میں اس سے بات کرتی۔ اور یہ دیکھ کر جھوما کا دل بے چین ہو اٹھتا۔ اور پھر یہ سلسلہ چلنے لگا۔ اور بھی کئی لڑکیاں اس کے گھر آنے لگیں اور جھوما کی بے چینی کا سبب بننے لگیں اور پھر ایک دن اسے پتہ چلا کہ دنیش نے کمپنی کے سامنے کان پور، آگرہ، متھرا وغیرہ سیلز ڈپو کے لیے لڑکیوں کی تقرری کی تجویز رکھی تھی اور کمپنی نے اس کی یہ تجویز مان لی تھی اور ان لڑکیوں کی تقرری کی ساری ذمہ داری اسی کو سونپ دی تھی۔ اب وہ ان شہروں میں جا کر مقامی امیدوار لڑکیوں کا انٹرویو لے گا اور جسے چاہے گا رکھ لے گا اور ان لڑکیوں کو رکھتے وقت

صرف ان کے حسن و جوانی، ان کی دلکشی و رعنائی ہی کو مد نظر رکھے گا تا کہ ان کے ساتھ کام کرتے وقت اس کا دل بہلا رہے لیکن اس کا علاج بھی کیا ہے؟ ــــــ اور اچانک اسے علاج سوجھ گیا۔ وہ دنیش کی محبت کا جواب سرد مہری سے دے گی! بے شک دنیش کو پتہ چل جائے کہ وہ اس کی محبت کا جواب اب گرم جوشی سے نہیں دے رہی۔ وہ اس کے لیے سرد ہوگئی ہے۔ سرد! بالکل برف!! اگر دنیش سمجھتا ہے کہ وہ محض اس کے جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے ہے تو وہ غلطی پر ہے ــــــ بس میں بیٹھی آنکھیں بند کیے، وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک زور کا دھماکا ہوا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر اسے اپنے اوپر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لال، پیلے، ہرے، نیلے رنگ۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے۔ چیخیں!! بھیانک آوازیں!! اندھیرا!!!

اور اس کے بعد اسے کچھ پتہ نہ چلا۔

بس ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں بیڈ پر لیٹی تھی۔

آج دو ماہ ہو چکے ہیں اس حادثہ کو۔ جھوما کے نیچے کا دھڑ اب تک بے حس ہے۔ ایک ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر آ گئی ہے۔ کب تک ہسپتال میں رہتی۔ جب کہ اس کا علاج اب صرف چند ایسی دواؤں پر مشتمل ہے جو اس کے اعصاب کو تقویت دے سکیں۔ اس کے اس علاج سے دنیش مطمئن نہیں ہے۔ اسے یقین ہے کہ جھوما کا مرض ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ جھوما کو جلد سے جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے اور چلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ جھوما کے گھر آنے کے بعد اس نے اسے نیورالوجی (Neurology) کے ماہر ڈاکٹر ماتھر کو بھی دکھایا ہے۔ اس نے بھی کچھ اسی طرح کا علاج تجویز کیا ہے۔ اس نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جھوما کو صحت یاب ہونے میں ایک لمبا عرصہ لگ جائے گا۔ دنیش نے نہایت ضبط کے ساتھ ڈاکٹر کی رائے سنی ہے اور جھوما کی اس بیماری کا مقابلہ کرنے

کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا ہے۔اب دفتر کے بعد اس کا سارا وقت جھوما کے بیڈ کے پاس گزرتا ہے۔جھوما کو دفتر میں ہوئی باتیں سناتا ہے۔اخبار یا کوئی رسالہ پڑھ کر سناتا ہے۔کبھی کسی تقریب میں جاتا ہے تو وہاں کے حالات سناتا ہے۔جھوما کے بیڈ کے پاس بیٹھا اکثر وہ اس کے پاؤں میں چٹکی بھر لیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ جھوما کو کچھ پتہ نہ چلا تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔اس کی یہ حالت جھوما سے چھپی نہیں رہی۔ جب وہ دنیش کی یہ قربانی دیکھتی ہے تو دکھی ہو اٹھتی ہے۔اسے پچھتاوا اس بات کا ہے کہ وہ دنیش کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔لیکن اس پچھتاوے کے ساتھ ہی ایک سوال اب بھی اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔اگر وہ دنیش کے ساتھ کسی حسین لڑکی کو دیکھ لے تو کیا وہ یہ برداشت کر سکے گی اور اس کے دل کی دھڑکن یکا یک تیز ہو جاتی ہے۔شاید ہاں !!شاید نہیں ؟!

اور وہ کچھ فیصلہ نہ کر پاتی۔

جب سے جھوما ہسپتال سے گھر آئی تھی اس کی چھوٹی بہن اس کے پاس رہ رہی تھی۔ وہی اس کے سب کام کرتی تھی جیسے اس کے کپڑے تبدیل کرانا، اس کے جسم پر اسپنج کرنا، اسپنج کر کے جسم پر پاؤڈر چھڑکنا۔اس کی ٹانگوں کی مالش کرنا وغیرہ اور اب وہ گھر واپس جانا چاہتی تھی۔ دنیش نے جھوما سے مشورہ کیا کہ ایک ایسی نرس کا انتظام کیا جائے جو دن رات اس کے پاس رہے۔کھانے پینے کے علاوہ اسے مناسب تنخواہ بھی دی جائے۔اسے جیسے متوسط آمدنی والے شخص کے لیے بے شک یہ کافی بوجھ ہوگا لیکن وہ اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھا اور پچھلے کئی دنوں سے وہ ایسی نرس کی تلاش میں تھا۔ اس نے امپلائمنٹ ایکسچینج کے ذریعہ بھی کئی امیدواروں کو بلایا لیکن ان میں سے کوئی بھی عورت جھوما کو پسند نہ آئی۔ کسی کا بہت چھوٹا بچہ تھا تو کوئی اپنے لباس سے صاف ستھری اور چست معلوم نہ ہوتی۔کوئی بالکل ہی ان پڑھ ہوتی تو کوئی بہت چالاک

نظر آتی تھی۔ انہوں نے اپنی جان پہچان والوں سے بھی کہہ رکھا تھا لیکن کوئی مناسب نرس نہیں مل رہی تھی۔

اور پھر ایک دن جھوما نے ایک نرس کا انتخاب کر ہی لیا۔

جھوما بیڈ پر لیٹی تھی اور اس کی بہن اسے اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ایک نئی امیدوار کمرے میں داخل ہوئی۔ بائیس تیئیس برس کی نہایت خوبصورت لڑکی۔ جھوما کی بہن نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اور جب جھوما نے اسے اسی وقت سے کام پر رکھ لیا تو اس کی چھوٹی بہن حیران رہ گئی۔

''دیدی! یہ تم نے کیا کیا۔؟ اتنی خوبصورت اتنی ہوش ربا لڑکی کو نرس کے لیے رکھ لیا جو دن رات یہاں رہے گی؟''

''کیوں؟۔ اس میں کیا حرج ہے۔؟''

''یہ تم کہہ رہی ہو دیدی!''

چھوٹی بہن کی حیرت اور بھی بڑھ گئی تھی—— اس حادثہ سے پہلے جھوما اسے کئی بار بتا چکی تھی کہ اسے اس کے جیجاجی پر کوئی اعتبار نہیں ہے—— ان کی کمپنی میں کئی خوبصورت لڑکیاں ہیں اور ان میں کئی فلرٹ قسم کی بھی ہیں۔ اور ان سب لڑکیوں کے انچارج وہی ہیں۔ نہ جانے کس کس کے ساتھ رومانس لڑا رہے ہیں؟! کس کس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں؟!

چھوٹی بہن ہونے کے ناطے وُہ اسے سمجھا تو نہیں پائی تھی لیکن اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

''دیدی! یہ تو عورت پر منحصر ہے۔ اگر اسے اپنے اوپر بھروسہ ہے، اپنی محبت پر یقین ہے تو کوئی دوسری عورت اس کی محبت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔''

اور اب کمپنی کی ان تمام حسین اور فلرٹ قسم کی لڑکیوں سے خائف ہوتے ہوئے

بھی وہ ایک خوبصورت لڑکی کو نرس رکھ رہی ہے! جو دن رات یہاں رہے گی ——؟!

جھوما نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف مسکرادی۔ اس کی چھوٹی بہن نے محسوس کیا جھوما جیسے اپنی وہ تمام باتیں بھول چکی ہے جو وہ اس سے کہا کرتی تھی یا وہ دنیش کے بارے میں سوچا کرتی تھی —— جھوما کو یاد تھی تو صرف اپنی اس بیماری میں دنیش کی خدمت اور دنیش کی قربانی! اس کے چہرے پر کسی طرح کے خوف یا وہم کا کوئی عکس نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نرس کے بے پناہ حسن سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔

شام کو جب دنیش گھر آیا تو جھوما کی چھوٹی بہن بولی۔

''جیجا جی! اب مجھے تو دیدی نے چھٹی دے دی ہے۔ میں کل اپنے گھر جا رہی ہوں۔

''کیا ——؟''

''جی —— دیدی نے اپنے لیے ایک نرس رکھ لی ہے۔''

''سچ ——؟ مل گئی نرس ——؟''

دنیش نے جھوما سے پوچھا اور اسی وقت نرس چائے کے ٹرے لیے اس کمرے میں داخل ہوئی دنیش نے نرس کی طرف دیکھا تو آنکھیں جھپکانا بھول گیا۔ جب وہ نرس پاس پڑی میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی تو اس کا دھیان جھوما کی طرف گیا۔ وہ جھوما کے پاؤں میں چٹکی بھرتے ہوئے بولا۔

''واقعی تمہاری پسند کی داد دینا پڑتی ہے!۔''

اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جھوما نے چٹکی بھرنے پر پاؤں ذرا سا پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔ اس نے فوراً دوسرے پاؤں پر چٹکی بھری اور جھوما نے وہ پاؤں بھی پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔ اور اب کی بار اس نے دو تین چٹکیاں باری باری اس کے دونوں پاؤں

پر بھر ڈالیں۔ اور اب تو جھوما کی بہن نے بھی نوٹ کیا کہ ہر چٹکی کے ساتھ جھوما نے اپنا پاؤں پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ یعنی ــــــ اس کی قوت احساس لوٹ آئی تھی!

دوسرے دن جب ڈاکٹر ماتھر نے جھوما کا معائنہ کیا تو بہت خوش ہوا۔

ڈاکٹر پر جوش لہجے میں بولا۔

''مسٹر نارائن آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ خدا نے آپ کی سن لی ہے۔ بس اب چند دنوں کی بات اور ہے مسز نارائن بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں گی۔ اور چلنے پھرنے لگیں گی۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد، خوشی سے سرشار دنیش نارائن ڈاکٹر کی رپورٹ لے کر جھوما کے بیڈ کے پاس گیا اور ڈاکٹر کی کچھ بدخط سی تحریر کو آہستہ آہستہ پڑھ کر جھوما کو سنانے لگا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا ــــــ ''مریضہ کی کیس ہسٹری، اب تک کے کیے گئے اس کے علاج اور اس کی اچانک صحت یابی کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نہ تو مریضہ کی ریڑھ کی ہڈی پر کوئی چوٹ آئی تھی، نہ اس کے اعصابی سسٹم کو کوئی ضعف پہنچا تھا اور نہ اس کے ذہن پر اس حادثے کی دہشت طاری تھی بلکہ مریضہ کی بیماری کے پیچھے کوئی لاشعوری طاقت کام کر رہی تھی جواب اچانک بے اثر ہوگئی ہے!''

رپورٹ کے آخری حصے کو کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے دنیش نے جھوما کی طرف دیکھا۔ جھوما اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جھوما کی نگاہوں میں شوخی تھی، محبت تھی، اعتراف تھا اور ندامت تھی۔ انہی جذبوں سے مسحور جھوما نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور دنیش نے اس نرم و نازک ہاتھ کو اپنے مضبوط اور سخت ہاتھوں میں لے لیا۔ ہلکا سا اسے دبایا اور پھر اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

جلتی بجھتی آنکھیں

میں بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس شخص کا جس نے دو روز پہلے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری بیوی کے آپریشن کے لیے حسبِ ضرورت صحیح گروپ کا خون مہیا کر دے گا۔ بلڈ (Blood) مہیا کرنا اس کا پیشہ تھا اور وہ بلڈ کنٹریکٹر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں یا اس کے پیشے کے بارے میں مجھے اسی روز معلوم ہوا تھا۔ میری بیوی کا بلڈ گروپ ''اے'' تھا اور آر۔ایچ فیکٹر نیگٹیو یعنی بلڈ گروپ ''اے نیگٹیو۔'' اس گروپ کا خون ہسپتال کے اپنے سٹاک میں بالکل نہیں تھا۔ میں نے مقامی ہسپتالوں کو بھی چھان مارا لیکن اس گروپ کا خون کہیں نہیں مِلا۔ آر۔ایچ نیگِٹو خون یوں بھی کم دستیاب ہوتا ہے اور پھر ''اے'' گروپ کے ساتھ آر۔ایچ۔نیگٹیو تو نایاب ہو جاتا ہے اور اب میں گھبرا گیا تھا —— آخر کہاں سے جٹاؤں گا اس گروپ کا خون؟ ڈاکٹر نے تو صاف کہہ دیا تھا اگر خون نہ ملا تو آپریشن نہیں ہو سکے گا اور آپریشن کو مزید ٹالنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ بھی ڈاکٹر ہی کی رائے تھی۔

اسی ہسپتال کے کمپاؤنڈر نے مجھے اس ٹھیکیدار کا پتہ بتایا تھا۔ اور اس سے ملنے کے بعد خون کی قیمت طے ہو جانے کے بعد، اب میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

میں ہسپتال کے لان میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کھڑا تھا کہ اچانک وہ مجھے

نظر آ گیا۔ تہمد اور کرتے میں ملبوس اس کا ہٹا کٹا جسم دور سے پہچانا جا سکتا تھا ـــــ وہ ایک دبلے پتلے آدمی کو ساتھ لیے چلا آ رہا تھا جیسے کوئی قصاب بکرے کو لا رہا ہو! ہمارے پاس پہنچتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیجئے ساب۔آپ کے لیے ''اے نیگٹیو'' گروپ کا بلڈ ڈونر لے آیا۔''

''بلڈ ڈونر۔؟! یہ ڈونر کیسے ہوا؟ ڈونر کا مطلب بھی سمجھتے ہیں آپ؟ اپنے خون کو بیچنے والے ڈونر نہیں کہلا سکتے۔ یہ مجبور لوگ۔ یہ جو تیس پینتیس آدمی ہر روز صبح میڈیکل کالج کے بلڈ بنک کے سامنے بیٹھے نظر آتے ہیں یہ بلڈ ڈونر کہاں ہیں۔ یہ تو اپنا خون بیچنے آتے ہیں۔ ان میں سے کئی صورتیں تو جانی پہچانی سی لگتی ہیں۔تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد آ کر اپنا بلڈ بیچنے والے ـــــ کبھی کبھی ہر دوسرے یا تیسرے دن ـــــ

''کیا سوچ رہے ساب؟''

''کچھ نہیں ـــــ ہاں تو آپ ڈونر لے آئے۔؟''

''جی ہاں ـــــ آپ ایک کی بات کرتے ہیں ـــــ یہاں منٹوں میں سو ڈونر لا کر کھڑے کر دوں۔ ایک سے ایک نایاب گروپ کا ڈونر اپنے ہاں مل سکتا ہے ـــــ آپ جو بھی گروپ کہیں۔ وہی حاضر کر دوں ـــــ پورے صوبے میں میرے ڈونر پھیلے ہوئے ہیں۔''

وہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا ـــــ اور میں مدقوق قسم کے اس بلڈ ڈونر کو دیکھ رہا تھا ـــــ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں؛ کبھی کبھی جلتی سی ہوئیں۔ کبھی بجھتی سی۔ سیاہ پڑ رہے چہرے پر ابھری ہوئی ہڈیاں ـــــ اس مریل سے شخص کے خون کی ایک بوتل کے لیے مجھے اس ٹھیکیدار کو پانچ سو روپے دینے تھے۔ ان پانچ سو روپوں میں سے وہ اس شخص کو کتنے روپے دے گا مجھے نہیں معلوم تھا ـــــ اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی تھی ـــــ مجھے تو اس وقت ''نیگٹیو اے'' گروپ کا خون درکار تھا اور وہ مجھے مل گیا تھا۔

جب میں اس ڈونر کو ڈاکٹر کے سامنے لے گیا تو ڈاکٹر نے اس کے خون کے اچھے یا برے کے بارے میں کوئی بات نہ کی بلکہ بلڈ کنٹریکٹر سے کہہ دیا کہ احتیاط کے طور پر ایک اور ڈونر کا انتظام کر دے ـــــ شاید مزید خون کی ضرورت پڑ جائے!

میری بیوی آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر میں جا چکی تھی۔ اور میں ہسپتال کے برآمدے میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس وقت وہ ٹھیکیدار ایک دوسرے ڈونر کو لے کر آ گیا۔ اس ڈونر کو وہ بریلی سے لایا تھا یہ ڈونر بھی پہلے والے ڈونر کی طرح مدقوق قسم کا آدمی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ کمزور تھا ـــــ اسے سامنے درخت کی چھاؤں میں بٹھا کر وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ـــــ اس کے ہونٹوں پر اسی طرح کی تاجرانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

اس ڈونر کی حد سے زیادہ گری ہوئی صحت کو دیکھ کر میں نے اس سے کہا۔

''یار ـــــ اس کے جسم میں تو جان ہی نہیں ہے ـــــ یہ خون کہاں سے دے گا۔؟''

وہ قہقہہ مار کر ہنسا ـــــ ''ارے ساب۔ کیا بات کرتے ہیں آپ بھی ـــــ آپ کے یہاں بلڈ دینے کے بعد اگر ضرورت پڑے تو دوسری جگہ بھی آج ہی اسی وقت بلڈ دے سکتا ہے۔''

''اچھا ـــــ!''

''جی ـــــ!''

اس نے مجھ سے طے کیا تھا کہ اگر ہمیں خون کی ضرورت نہ پڑی تو وہ مجھ سے اپنا اور ڈونر کا بریلی تک کا آنے جانے کا کرایہ لے لے گا ـــــ اور تیس روپے خرچے کے ـــــ اس طرح تقریباً ستر روپے مجھے دینے ہوں گے ـــــ اور اگر خون دیا گیا تو دوسری بوتل کے بھی پانچ سو روپے ہوں گے۔

دوسری بوتل کے دام کم کرنے کے خیال سے میں نے اس سے کہا——

''یار—— دو بوتل خون کے لیے کچھ تو رعایت ہونی چاہئے—— دوسری بوتل کی ضرورت پڑی تو قیمت کچھ تو کم کر دو گے نا؟''

''کیا کہہ رہے ہیں ساب؟ آپ کو اس نایاب گروپ کے پانچ سو روپے فی بوتل زیادہ نظر آرہے ہیں—— جناب اس کا ریٹ تو اس وقت سات سو روپے فی بوتل چل رہا ہے۔ اور آپ کو پانچ سو روپے زیادہ لگ رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ عام گروپ کے ڈونر کا ریٹ کتنا کم ہوتا ہے—— صرف چالیس روپے فی بوتل۔ اس میں مجھے کیا ملتا ہے؟ مشکل سے پندرہ روپے—— اور بزنس کے اخراجات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس بات کو تو آپ سوچیں گے نہیں—— اور پھر مجھے اس کیس میں کیا ملنا ہے؟ صرف تین سو روپے—— اسی روپے ڈونر لے لے گا—— پچاس ساٹھ روپے اسے لانے لے جانے کا بھاڑا—— اور اس کا خرچہ—— اس کے علاوہ خون دینے سے پہلے سنگترے کے جوس کا گلاس پلاتا ہوں—— خون دینے کے بعد دودھ کا گلاس پلاتا ہوں۔ اور جو اسے آئرن ٹیبلٹ کھلانی پڑتی ہیں وہ الگ——''

''آئرن ٹیبلٹ——؟ کیا مطلب——؟''

''جناب یہ خون بھی سسری عجیب شے ہے——فوراً بننا شروع ہو جاتا ہے—— جتنا نکلتا ہے اتنا ہی دو دن میں بن بھی جاتا ہے ——اور ڈونر پھر تیار—— لیکن دوسری بار اگر کم وقفے کے بعد خون نکالو تو اس میں لوہے کی کمی ہو جاتی ہے——اس لیے ڈونر کو آئرن ٹیبلٹ کھلانی پڑتی ہے——''

اب وہ مجھے ایک ماہر ڈاکٹر نظر آرہا تھا جو باوجود اس کے کہ کم پڑھا لکھا تھا خون کے بارے میں کافی واقفیت رکھتا تھا۔ مجھے خون کے معیار کے بارے فکر لاحق ہوگئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''جو خون تم نے پہلے والے ڈونر کا دلوایا ہے وہ کتنے وقفے کے بعد نکالا گیا ہے ــــــ؟ اور یہ دوسرا ڈونر جو تم اب لائے ہو، اس سے پہلے کب خون دے چکا ہے؟''

وہ کچھ چڑ سا گیا ــــــ

''ارے ــــــ اب آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے ــــــ آپ تو جانتے ہیں نیگٹیو۔آر۔ایچ والا ''اے'' گروپ کا خون آسانی سے نہیں ملتا ــــــ اس کے ڈونر بہت کم ہیں۔ جتنے ڈونر میرے پاس ہیں انہی سے تو سب کی ضرورت پوری کرنی ہے ــــــ انہی ڈونر کا تھوڑے تھوڑے دنوں بعد خون لینا پڑتا ہے ــــــ کیا کیا جائے ــــــ؟ ویسے آپ خاطر جمع رکھیں میرے سپلائی کیے ہوئے خون میں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی ــــــ پروٹین بھی پانچ سے کم نے ہوگا ــــــ''

''پروٹین ــــــ؟ اچھا ــــــ اچھا ــــــ''

میں جانتا ہوں کہ انسانی خون میں پانچ سے لے کر سات فی صدی پروٹین ہوتا ہے۔اس ٹھیکیدار کے لائے ہوئے ڈونر کے خون میں بھی پانچ سے کم پروٹین تو نہیں ہوگا ــــــ پانچ سے کم ہوتا تو ڈونر چلتا پھرتا نظر نہ آتا ــــــ اور پانچ سے زیادہ کی امید رکھنا فضول ہے میں نے دل کو سمجھا لیا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

''اور حضور! یہ دوسرا والا ڈونر تو یونیورسل ڈونر ہے۔یعنی ہر مرض کی دوا۔

اس کا خون ''او گروپ'' کا ہے۔اور آر۔ایچ نیگٹیو ہے۔اس کا خون ہر نیگٹیو گروپ یعنی نیگٹیو اے۔نیگٹیو بی یا نیگٹیو اے۔بی کے کام آسکتا ہے۔اس لیے اس ڈونر کی ہمیں بہت ضرورت رہتی ہے۔پر یہ بیچارا بھی کیا کرے؟ ہر روز تو اپنا خون نہیں دے سکتا ــــــ مناسب مقدار میں خون بننے کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔چار پانچ روز کا وقفہ

تو دینا ہی پڑتا ہے۔''

ہم لوگ باہر اس ٹھیکیدار کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ اور اندر آپریشن تھیٹر میں میری بیوی کا آپریشن ہو رہا تھا ـــــــ اندر سے خبر آ گئی تھی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ اور جب یہ پتہ چلا کہ مزید خون کی ضرورت نہیں ہے تو ٹھیکیدار کو مایوسی ہوئی۔ اس کا ایک ڈونر کا اچھا خاصہ منافع مارا گیا تھا۔ مجھے اب اس کو صرف ستر روپے کے قریب دینے تھے۔

''اچھا سیٹھ! یہ بتاؤ تم کس کس شہر میں خون سپلائی کر سکتے ہو؟''

میں نے اس کی اداسی دور کرنے کی کوشش کی

''ارے سرکار۔ پورے صوبے میں کہیں بھی ـــــــ دو سو سے زیادہ ڈونر میرے پاس ہیں۔''

اس کی اداسی واقعی دور ہوگئی تھی۔ وہ پھر چہکنے لگا۔

''کئی ہسپتالوں کے ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کے پاس میرا پتہ ہے۔ لیجئے میرا کارڈ''

اس نے جیب سے ایک، میلا کچیلا کارڈ، نکالا ـــــــ اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''اور ضرورت پڑنے پر اپنا بلڈ بھی دے دیتا ہوں اور وہ بالکل مفت۔''

'''' تمہارا بلڈ گروپ؟''

''اپنا بلڈ گروپ ''بی'' ہے ساب''

اور مجھے اچانک یاد آیا کہ جب دو دن پہلے وہ ہسپتال کے کمپاؤنڈر کے ذریعہ ملا تھا۔ تو پاس کھڑے میری ہی طرح کے ایک ضرورت مند آدمی کو بتا رہا تھا ـــــــ

''اپنا بلڈ تو ہم فری دیتے ہیں ساب۔ پر کیا کیا جائے ہمارا بلڈ گروپ ''اے'' ہے۔ اور آپ کو ضرورت ہے بلڈ گروپ ''بی'' کی ـــــــ

اس کی چالاکی پر میں دل ہی دل میں ہنس دیا____

ابھی تک اس ڈونر کو نہیں بتایا گیا تھا کہ اب اس کے بلڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ پان کھا کر واپس آئے تو اس نے اس ڈونر کو اپنے پاس بلایا اور اسے کچھ روپے دیتے ہوئے بولا____

''یہ لو بھیا اپنا کرایہ بھاڑا____ اس وقت تو تمہارے خون کی ضرورت نہیں ہے____ پھر کبھی سہی____ اب تم جاؤ____''

میں اس ڈونر کے چہرے پر کسی اداسی کا تصور کیے ہوئے تھا____ اس کی بھی تو آمدنی ماری گئی تھی____ لیکن خلاف توقع اس ٹھیکیدار کی بات سن کر اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں چمک سی آگئی____ اور پھر____ اور پھر وہ آنکھیں یکدم بجھ گئیں____

الوداع

دس دن ہو گئے تھے مسٹر اور مسز مارٹن کو شملہ میں آئے ہوئے لیکن ابھی تک انہیں تارابی بی کا کچھ بھی پتہ نہ چلا تھا۔ تارابی بی، جس کی چالیس برس پہلے کی شکل اپنے مکمل اور واضح خدو خال کے ساتھ مسز مارٹن کے ذہن میں اب بھی موجود تھی، لیکن جس کی اس وقت کی صرف ایک ہی تصویر مسز مارٹن کے پاس تھی جو اب نہایت دھندلی ہو چکی تھی، اس تصویر میں تارابی بی ایک آٹھ برس کی بچی کے ساتھ کھڑی تھی اور وہ بچی تھی خود مسز مارٹن جو اس وقت مس ڈولی ولیم تھی۔ اور اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ شملہ میں رہتی تھی۔ اور وہاں کے ایک کانونٹ اسکول میں پڑھتی تھی۔ تارابی بی اس کی آیا تھی۔ شملہ کے پاس ایک گاؤں کی رہنے والی تقریباً پچیس چھبیس برس کی ایک پہاڑی عورت جو ان پڑھ ہونے کے باوجود پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بات کرتی تھی۔ تارابی بی کے گاؤں کا پتہ مسز مارٹن کے پاس نہیں تھا۔ اسے آیا رکھتے وقت اس کے والدین مسٹر اور مسز ولیم نے اگر اس کا پتہ کہیں نوٹ کیا بھی تھا تو وہ اب مل نہیں سکتا تھا۔ اور اب تو مسز مارٹن کے والدین کے انتقال کو بھی کئی برس ہو چکے تھے!

ہندوستان کی آزادی سے پہلے انگلینڈ کے رہنے والے مسز ولیم شملہ میں ایک اونچے سرکاری عہدے پر تعینات تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ڈولی شملہ میں ہی

پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے تارابی بی کو اس کی آیا کے طور پر رکھا تھا۔

تارابی بی ایک بیوہ عورت تھی جس کا کوئی بچہ نہ تھا—اس نے ڈولی کی خدمت تو ایک آیا کی طرح کی لیکن اسے پیار ایک ماں کا دیا۔ اور بچے تو پیار کو بہت پہچانتے ہیں—ڈولی بھی آیا کو جیسے ماں ہی سمجھتی تھی۔ اس کی ماں نے تو اسے گود میں بھی اتنا نہ لیا ہوگا۔ ڈولی دن بھر آیا کے ساتھ رہتی اور رات کو آیا ہی اس کے کمرے میں سوتی—ہاں البتہ ڈولی اسے پکارتی ''آیا'' ہی کے نام سے تھی—''ممی'' کا لفظ اس کی ماں کے لیے مخصوص تھا۔ جب پانچ برس کی ہوئی اور اسکول جانے لگی تو اس اسکول کے بعد اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل میں بھی وہ آیا کو شریک کر لیتی۔

جب ڈولی آٹھ برس کی ہوئی تو ولیم کو اچانک شملہ چھوڑنا پڑا۔ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اور بہت سارے انگریز افسر واپس انگلینڈ جا رہے تھے۔ مسٹر ولیم نے بھی اپنا تبادلہ واپس انگلینڈ کروالیا تھا۔ جس دن وہ لوگ شملہ چھوڑ رہے تھے۔ تارابی بی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ پچھلے دو ہفتہ سے اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اس طرح شملہ سے جاتے وقت ڈولی اپنی آیا سے نہ مل سکی۔ اور اس کے معصوم ذہن میں آیا سے بچھڑنے کا ہی نہیں اس کو گڈ بائی نہ کہنے کا دکھ بھی جم کر رہ گیا—

بہت دنوں تک وہ آیا کو یاد کر کے چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی—ممی ڈیڈی سے اگر آیا کے بارے میں کبھی بات کرتی تو اپنی اداسی ظاہر کیے بغیر—اسے اس عمر میں بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ممی ڈیڈی آیا کے لیے اس کی اداسی کو کبھی برداشت نہ کریں گے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر اس کی اداسی دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے وہ ان کے سامنے اپنی اداسی چھپا لیتی—پھر آہستہ آہستہ اس کی اداسی دور ہوتی گئی۔ لیکن آیا کی یاد

اس کے ذہن میں اب بھی بنی رہی۔ اور جب بھی اسے آپا یاد آتی اس کی تصویر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اس کے سامنے ابھر آتی ـــــ اور اس وقت وہ بے اختیار سی ہو کر البم اٹھالیتی اور اس میں لگی آپا کی اور اپنی تصویر دیکھنے لگتی ـــــ وقت گزرتا گیا اور وہ اسکول کے بعد کالج کی طالب علم بنی اور اب اس کا شعور اسے سمجھانے لگا کہ آپا کی موجودہ شکل تو اب اس تصویر سے کافی بدل گئی ہوگی۔ جو تصویر کہ اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے یا جو تصویر کہ البم میں لگی ہے۔ عمر نے اس پر ضرور اپنا اثر دکھایا ہوگا۔ اور اس وقت وہ اپنے ذہن میں آپا کی ایک نئی تصویر بنانے لگتی جس میں بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ـــــ طالب علمی کے زمانے ہی میں اس نے سوچ لیا کہ وہ ایک بار ہندوستان ضرور جائے گی اور شملہ بھی جائے گی اپنی آپا سے ملنے اور اپنی اس خواہش کے زیر اثر اس نے ایک ہندوستانی کلاس میٹ سے تھوڑی سی ہندی تھوڑا سا اردو اور بول چال کی ہندوستانی سیکھ لی۔ طالب علمی کے خاتمے کے بعد اس کی شادی ہوگئی اور وہ مس ولیم سے مسز مارٹن ہوگئی۔ اور پھر دو بچوں کی ماں بن گئی ـــــ اور اس کے بعد اس کے والدین بھی یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئے ـــــ

اس تمام عرصے میں اس نے کئی بار آپا کو یاد کیا اور ہر بار یہ بھی سوچا کہ آپا تو اب بوڑھی ہو چکی ہوگی ـــــ البم میں وہ جب بھی آپا کی تصویر دیکھتی، اس تصویر میں اس کی بڑھتی ہوئی عمر کی نسبت سے تبدیلی ہونے لگتی ـــــ اس نے کئی بار اپنے شوہر سے کہا تھا ـــــ ہندوستان چلیں ٹورسٹ کے طور پر ـــــ

''ہندوستان میں نے بھی کہاں دیکھا ہے ـــــ آٹھ برس ہی کی تو تھی جب ممی ڈیڈی نے ہندوستان چھوڑا تھا ـــــ بس شملہ تھوڑا سا یاد ہے ـــــ اپنا اسکول بھی یاد ہے ـــــ لوئر بازار اور رج بھی یاد ہے ـــــ اور مال روڈ کے پاس کا وہ علاقہ جہاں ہماری کاٹیج تھی ـــــ''

اس کا شوہر اپنی خواہش ہوتے ہوئے بھی اب تک ہندوستان آنے کا پروگرام نہ بنا سکا تھا ــــــ اور اب چند ساتھیوں کے ساتھ اس نے پروگرام بنا لیا تھا اور وہ لوگ ہندوستان آئے تھے ــــــ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہندوستان کے کئی مقامات دیکھنے کے بعد وہ اپنے شوہر کو شملہ لے آئی تھی۔ اپنے بچپن کا شہر خود دیکھنے اور اپنے شوہر کو دکھانے کے لیے اور سب سے زیادہ آپا سے ملنے کی اپنی شدید خواہش کی تکمیل کے لیے ــــــ

آپا کے بارے میں وہ اپنے شوہر کو بہت پہلے بتا چکی تھی ــــــ شادی کے دوسرے ہی دن، اسے اپنی فیملی البم دکھاتے ہوئے اس تصویر کے سامنے وہ رک گئی ــــــ

''لو پہچانو...... یہ کون ہے؟''

''ارے! نہیں پہچان سکے؟ یہ میں ہوں ــــــ اور یہ میری آپا تھی ــــــ تارابی بی ــــــ مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ اور میں بھی بہت اٹیچڈ (Attached) تھی اس کے ساتھ ــــــ لیکن جانتے ہو میں وہاں سے آخری بار اس سے مل بھی نہ پائی ــــــ''

اور اس کے شوہر نے اس کو بہت دلچسپی سے دیکھا تھا جیسے اس کی شکل میں سے آٹھ برس کی اس بچی کو تلاش کر رہا ہو جو اپنی آپا کے ساتھ بہت اٹیچڈ تھی ــــــ

جب شادی کے اتنے عرصے کے بعد ہندوستان آنے کا پروگرام بنا تو اس نے اپنے شوہر سے صاف کہہ دیا'' ــــــ دیکھو ہندوستان چل رہے ہیں تو شملہ ضرور جائیں گے ــــــ'' اور اس کے شوہر نے اپنی رضامندی دے دی تھی اور وہ شملہ میں تھی ــــــ آپا کی اس دھندلی تصویر کے ساتھ جو وہ اپنی البم میں سے نکال لائی تھی۔ اور اپنے ذہن میں بسی آپا کی چالیس برس پہلے کی اس تصویر کے ساتھ جس کے خدوخال اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے ذہن میں موجود تھے ــــــ اور ایک غیر واضح سی، تیسری تصویر کے ساتھ جو اس نے آپا کی موجودہ عمر کی نسبت سے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی ــــــ

شملہ میں رہنے والے کئی پہاڑی لوگوں سے، گھوڑے والوں سے، دکانوں اور

ہوٹلوں میں کام کرنے والے نوکروں سے اور پہاڑی مزدوروں سے وہ لوگ مل چکے تھے ـــــــ اور شملہ کے آس پاس کے کئی پہاڑی گاؤں دیکھ چکے تھے۔ انہیں کم سے کم چار تارا نام کی عورتیں ملی تھیں ـــــــ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کی تارابی بی نہ تھی۔ تارابی بی تو اس وقت تقریباً پینسٹھ برس کی ہوگی اور جو بھی تارا ملی تھی وہ پچاس برس سے زیادہ کی ہرگز نہ تھی ـــــــ تقریباً ہر پہاڑی گاؤں کے پردھان یا کسی بزرگ کے پاس انہوں نے شملہ کے سمر ہل گیسٹ ہاؤس کا پتہ چھوڑ دیا تھا، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور جن گاؤں میں وہ نہیں جا سکے تھے وہاں انہوں نے اپنے پرچے بٹوا دیئے تھے ـــــــ اور اب تو پچھلے کئی دنوں سے شملہ کے اس گیسٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی آ کر انہیں کسی تارا کے بارے میں بتانے لگا تھا ـــــــ کبھی کسی گاؤں کا کوئی آدمی اور کبھی شملہ کا ہی کوئی باشندہ۔

''صاحب! ایک تارا تھی ہمارے گاؤں میں ـــــــ تارا متی ـــــــ بس یہی عمر ہوگی جو آپ بتا رہے ہیں ـــــــ اور وہ گرین ہوٹل میں کام کر رہی ہے اس وقت ـــــــ''

اور وہ اس ہوٹل میں پتہ کرنے چلے گئے لیکن وہاں انہیں موٹا سا تلک لگائے ایک تارا متی ملی جو یہ بھی نہ بتا پائی کہ اس نے کب اور کس انگریز کے یہاں آیا گری کی تھی۔

''حجور ـــــــ تارا بائی میری خالہ زاد بہن ہے ـــــــ شروع سے ہی وہ آیا کا کام کر رہی ہے ـــــــ اس وقت بھی دہلی میں آیا گری کرتی ہے ـــــــ اگر حکم دیں تو میں اس کو بلوا لوں حجور ـــــــ''

لیکن دو ہی چار سوال و جواب میں پتہ چل جاتا کہ وہ بھی اس کی تارابی بی نہیں ہے۔

تارا متی ـــــــ تارا بیگم ـــــــ تارا بائی ـــــــ اسے نہیں پتہ تھا کہ اس کی تارابی بی مسلمان تھی یا ہندو ـــــــ اسے تو بس اتنا یاد ہے کہ تارابی بی اس کے ساتھ گرجا میں بھی

جاتی تھی۔

انہوں نے واپسی کا پروگرام بنا لیا تھا ——— اور تین دن بعد وہ شملہ سے ہی نہیں ہندوستان سے بھی جانے والے تھے ——— اور مسز مارٹن نہایت افسردہ تھی ———

وہ صبح سویرے گیسٹ ہاؤس کے لان میں بیٹھے شملہ کی دھوپ کا مزہ لے رہے تھے کہ اچانک ایک بوڑھی عورت اندر داخل ہوئی اور کچھ عجیب بے ڈھنگی چال کے ساتھ ان کی طرف بڑھتی چلی آئی ——— وہ ان کے نزدیک پہنچی تو مسز مارٹن کو لگا کہ وہ عورت اس تصویر سے کافی ملتی جلتی تھی جو تصویر کہ اس نے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی ——— اسے وہ چہرہ اپنی طرف کھینچتا سا محسوس ہوا ———

''میم صاحب ——— ہمارے گاؤں کے پردھان نے یہ پرچہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم آپ سے مل لیں ———'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرچہ ان کے سامنے کر دیا۔

مسز مارٹن جواب میں کچھ نہیں بولی۔ وہ اب بھی بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی ——— اور مسٹر مارٹن کبھی اسے دیکھتے اور کبھی مسز مارٹن کو ———

''کیا نام ہے تمہارا ———؟''

''ہمارا نام ———؟ ہمارا نام تو ہم کو نہیں معلوم ———''

''تم تارا بی بی کو جانتی ہو ———؟''

''تارا بی بی ——— میم صاحب! آپ تارا بی بی سے ملنا چاہتے ہیں ———؟''

''ہاں ——— آپ ہمیں اس سے ملا سکتی ہیں ———؟''

''ضرور ملا سکتے ہیں ——— آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا ———''

''کہاں ———؟''

''ہمارے گاؤں میں ——— ہمارے گھر میں ——— بس پاس ہی میں ہے ہمارا گاؤں ——— گلن چشمہ کے پاس سے راستہ جاتا ہے ———''

مسٹر مارٹن نے جب مسز مارٹن کو چلنے کے لیے تیار دیکھا تو اس سے انگریزی میں بولے——

''دیکھو—— مجھے تو یہ کوئی نیم پاگل عورت لگتی ہے—— کوئی فائدہ نہ ہوگا اس کے ساتھ جانے کا——''

''نہیں ڈارلنگ —— چلنا تو ضرور چاہئے—— کیا پتہ مجھے میری آیا مل جائے——؟''

اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی—— مسٹر مارٹن بھی تیار ہو گئے——

''چلو بھئی—— اگر تم چاہتی ہو تو——''

اور تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ ٹیکسی میں چلے جا رہے تھے——

اس کے سامنے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی اس عورت کو دیکھ کر مسز مارٹن سوچ رہی تھی—— اگر وہ آرٹسٹ ہوتی اور ہر سال آیا کی تصویر بناتی ۔تو اس کی موجودہ تصویر یقیناً اس عورت سے میل کھا رہی ہوتی——!

ٹیکسی ایک جگہ کھڑی کر کے وہ لوگ اس کے ساتھ پہاڑی راستے پر ہو لیے—— جب سے وہ شملہ آئے تھے تقریباً روز ہی ان پہاڑی راستوں پر چلتے رہے تھے۔کبھی اوپر بہت اوپر—— کبھی نیچے ——بہت نیچے —— کبھی سڑک پر —— کبھی پہاڑی پگڈنڈی پر—— ان پہاڑی راستوں پر چلنے کی تو اب انہیں مہارت ہوگئی تھی —— لیکن وہ بوڑھی عورت ان سے بہت آگے نکل جاتی اور پھر ایک چٹان پر بیٹھ کر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگتی—— اور پھر اس کا گاؤں آ گیا۔ پتھروں کی دیواروں اور ٹین کی چھتوں سے بنے چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں۔

چار پانچ گھروں کے بعد وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''لو—— میم صاحب—— ہم تارا بی بی کے گھر آ گئے——''

کوٹھری کا دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے اور وہ انہیں سامنے دیوار پر لگی تصویر کے پاس لے گئی۔

''یہ دیکھو ــــــ یہ رہی تارابی بی ــــــ''

اور اس تصویر کو دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ تصویر اس تصویر کی کاپی تھی جو تصویر مسز مارٹن کی پاس تھی ــــــ آٹھ برس کی ڈولی اور اس کے اس کھڑی تارابی بی ــــــ مسز مارٹن کو اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا ــــــ شاید چالیس برس!

''اماں ــــــ یہ تارابی بی خود کہاں ہے؟'' اس نے جیسے نیند سے بیدار ہو جانے کے بعد اس سے پوچھا۔

''ارے ــــــ یہی تو ہے تارابی بی ــــــ''

وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ عورت کھوئے ہوئے انداز میں بولی!۔

''جب اسے پتہ چلا کہ اس کی ڈولی بابا بہت دور چلی گئی ہے ــــــ بہت دور ــــــ تو پھر اسے کیا کرنا تھا یہاں رہ کر ــــــ وہ بھی چلی گئی ــــــ بس یہ تصویر چھوڑ گئی یہاں۔''

''سنو اماں ــــــ میں ہی وہ ڈولی ہوں۔

''ڈولی ہو تم ــــــ؟ تُم کیسے ڈولی ہو سکتی ہو ــــــ ڈولی تو وہ ہے ــــــ چھوٹی سی ــــــ تم تو اتنی بڑی ہو ــــــ'' اور وہ ہنسنے لگی ــــــ بالکل دیوانوں کی سی ہنسی ــــــ

''اماں ــــــ تم ہی تارابی بی ہو نا ــــــ؟''

''ارے ــــــ! تم پھر ویسی باتیں کرنے لگی ــــــ میں کہاں ہوں تارابی بی ــــــ تارابی بی تو وہ ہے۔ جس کے پاس ڈولی کھڑی ہے ــــــ وہ تو چلی گئی ــــــ''

مسٹر مارٹن ایک بار پھر انگریزی میں بولے ــــــ

''ڈارلنگ ــــــ کچھ فائدہ نہیں ــــــ یہ ایک نیم پاگل عورت ہے ــــــ نہ جانے یہ

تصویر کہاں سے لے آئی ـــــ چلو ـــــ اب چلتے ہیں ـــــ ''

''اچھا اماں ـــــ ہم چلتے ہیں ـــــ'' مسز مارٹن روہانسی ہوگئی ـــــ

''سنو ـــــ ادھر آؤ ـــــ ادھر میرے پاس ـــــ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ـــــ''

اور مسز مارٹن جیسے کھنچتی سی چلی گئی اس کے پاس ـــــ اس نے بڑھ کر۔ ذرا سا اچک کر مسز مارٹن کا ماتھا چوم لیا ـــــ اور پھر اس کے گال کو چوم لیا ـــــ

''سچ ـــــ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ـــــ''

جب وہ لوگ اسی پگڈنڈی سے نیچے اتر رہے تھے ـــــ تو مسز مارٹن نے اچانک اپنی چال مدھم کردی ـــــ

''سنو ڈارلنگ ـــــ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ یہی تارابی بی ہے ـــــ میری آیا ـــــ اس نے جو مجھے چوما ہے نا ـــــ میرے گال پر ـــــ میرے ماتھے پر ـــــ میں وہ پہچانتی ہوں ـــــ میں اس کے ہونٹوں کالمس پہنچانتی ہوں ـــــ میری ممی نے اس کو منع کر رکھا تھا کہ مجھے نہ چومے ـــــ لیکن وہ چوری چھپے مجھے چوم لیتی تھی ـــــ میرے ماتھے ـــــ پر ـــــ میرے گالوں پر ـــــ سینے سے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کرتے وقت وہ بے بس سی ہو جاتی تھی ـــــ اور اس کے چومنے کو میں نے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ میں اس کے چومنے کو بھول نہیں سکتی ۔کیسے بھول سکتی ہوں ڈارلنگ ـــــ یہ وہی تارابی بی ہے ـــــ میری آیا ـــــ لیکن میں کیا کروں ـــــ ؟! یہ مان کیوں نہیں رہی ـــــ ؟ میں کیا کروں ـــــ ؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــ تو وہ گھر سے کافی ادھر آ کر ایک چٹان پر بیٹھی انہی کو دیکھ رہی تھی!

اس کا سب سے بڑا دُکھ

یہ دوسرا سفید بال ہے جو تین دن کے اندر مجھے اپنے سر میں نظر آیا ہے۔

تین ہی دن پہلے میں نے اپنے سر میں سے ایک سفید بال نکالا تھا۔لیکن اس وقت میں نے سوچا تھا۔ایک آدھ سفید بال تو جوان سر میں بھی ہوتا ہے،اور میں نے اپنے دل پر اس کا اثر نہیں ہونے دیا تھا،اور اب پھر یہ سفید بال!

آئینے کے سامنے کھڑی،اس سفید بال کو کنگھی سے کریدتے ہوئے میں سوچ میں ڈوب جاتی ہوں۔یوں میں تیس برس کی ہونے پر بھی،بائیس تیئس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔لیکن بالوں کے اس طرح تیزی سے سفید ہو جانے پر تو میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ کی معلوم ہونے لگوں گی!یہ سوچ کر میرے بدن میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اداسی میں گھری کھڑی تھی کہ ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

''تو بیٹا!نشو کے خط کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟''

ماں کے ان الفاظ نے وقتی طور پر مجھے اس اداسی سے باہر نکال لیا۔نشو میری بہن ہے۔میری چھوٹی بہن۔مجھ سے پانچ برس چھوٹی۔میری یہی ایک بہن ہے۔اس سے چھوٹا ایک بھائی ہے،راجی۔اپنی اس بہن اور اپنے بھائی راجی کی خوشیوں کے لیے میں نے شادی نہیں کی۔پتاجی کا اچانک انتقال ہو گیا تو گھر کی ساری ذمہ داری میں نے اپنے

اوپر لے لی تھی۔ میں نے اپنی تعلیم چھوڑ کر ملازمت کر لی تھی۔ اس طرح راجی اور نشو کی تعلیم جاری رکھی تھی۔

نشو کے گریجویٹ ہو جانے کے بعد، اس کی شادی کے لیے لڑکا بھی میں نے ہی تلاش کیا تھا، ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا، پروقار شخصیت کا مالک لڑکا، جو ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی میں برانچ منیجر ہے۔ نشو کے لیے یہ میچ تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ نشو کا شمار حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ اپنے کالج میں اسے ''بیوٹی کوئین'' کا خطاب ملا تھا۔ کوئی بھی لڑکا ایسی حسین بیوی پا کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے گا۔ جب نشو کی شادی کی بات چل رہی تھی تو اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ ماں سے کہہ دوں۔ ماں کیوں نہ پہلے میں اپنا گھر بسا لوں؟۔ میں بڑی ہوں۔ پہلے میری شادی ہو جائے۔ پھر نشو کی ہو جائے گی اور کسی کسی وقت مجھے محسوس ہوتا جیسے میری ہی شادی کی بات چل رہی ہو! لیکن پھر میں نے اپنی ذمہ داری کا احساس کر کے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ نشو کی شادی میں نے نہایت شان و شوکت سے کی۔ اپنے دفتر سے قرض بھی لیا۔ لڑکے کے ماں باپ رشتہ دار سب خوش تھے۔ امید تھی کہ نشو کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارا بنے گی۔ لیکن چھ ہی ماہ بعد اس نے لکھا۔

''دیدی! بیدی صاحب کے بارے میں کیا لکھوں—؟ ان کا دل تو گھر میں لگتا ہی نہیں۔ وہ ادھر ادھر دل بہلانے کے عادی ہیں......''

ماں نے یہ سن کر تشویش کا اظہار کیا لیکن میں نے اسے ہنسی میں ٹال دیا۔ جب دوسرے خط اور پھر تیسرے خط میں بھی اس نے یہی رونا رویا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

''دیدی! اب میرا ان کے ساتھ نباہ ہونا مشکل ہے۔ ان کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ میرے لیے اچھا ہے میں ان سے علیحدگی اختیار کر لوں۔'' یہ سن کر ماں رو پڑی۔ میں بھی سوچ میں ڈوب گئی۔

ماں نے اسی وقت کہہ دیا—— ''تم جاؤ! دونوں کو سمجھا بجھا کر ان کا گھر اجڑنے سے بچاؤ۔ اور یا پھر میں جاتی ہوں۔'' میں نے جواب میں ''اچھا'' کہا اور خاموش ہوگئی۔

اور اب نشو کا خط آئے چار دن ہو چکے تھے!

ماں روزانہ ہی پوچھ رہی ہے—— ''تم جاؤ گی یا میں جاؤں؟''

میں سوچ میں ڈوب جاتی ہوں۔ ہم میں سے کوئی بھی جا کر کیا کرلے گا——؟ نشو نادان ہے نہ بیدی صاحب ناسمجھ۔

لیکن آج جب ماں نے پھر پوچھا تو میں نے کہہ دیا——

''اچھا ماں! میں کل ہی چلی جاؤں گی۔ آج چھٹی کے لیے درخواست دے دوں گی۔''

نشو اور بیدی صاحب آج کل آگرہ میں ہیں۔ شادی کے تین ہی ماہ بعد ان کا تبادلہ آگرہ ہوگیا تھا۔ اس وقت پہلی بار نشو بیدی صاحب کے ساتھ چار دن کے لیے ہم سب سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ بیدی صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر وہ ہمارے پاس کچھ دن اور رہ جاتی۔ لیکن نشو ان کے ساتھ ہی آگرہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ شادی کے بعد اس کا پہلی بار میکے آنا اور میکے میں صرف چار دن ٹھہرنا، مجھے کھٹکا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نشو شاید بیدی صاحب سے دور نہیں رہ سکتی، میں خاموش ہوگئی۔ اور ماں—— ماں تو خوش تھی کہ بیٹی کو سسرال میں اتنا پیار مل رہا ہے کہ اسے میکے کی اب یاد ہی نہیں آتی!

ان چار دنوں میں بیدی صاحب نے ہمارا ہی نہیں، پاس پڑوس والوں کا بھی من موہ لیا تھا۔ یوں ہنس ہنس کر بات کرتے جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں! ملنے والوں کی نگاہوں میں ان کے لیے تعریف دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ دل میں خوشی محسوس ہوتی۔ کہ اتنے اچھے بیدی صاحب ہمارے ہیں۔ ہمارے اپنے! دل چاہتا تھا،

بیدی صاحب کچھ دن اور ہمارے ہاں رہیں۔ لیکن وہ اور زیادہ نہیں رُک سکتے تھے۔ وہ نشو کو لے کر چلے گئے۔ اور اب —— میں ان کے پاس جا رہی تھی۔ لیکن کتنے بدلے ہوئے حالات میں؟! یوں میں ان کے پاس رہنے کے لیے جاتی تو کچھ اور بات تھی۔ لیکن میں تو ایک ناخوشگوار ماحول میں جا رہی تھی۔ نشو اور بیدی کی ایک دوسرے کے خلاف شکایتیں سننے کے لیے! معاملہ سلجھنے کی بجائے بگڑ بھی تو سکتا ہے! کہیں میرے ہی منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی تو —— ؟؟ لیکن مجھے نشو ہی کو سمجھانا ہوگا! —— نشو میری چھوٹی بہن ہے۔ اسے سمجھانا میرا حق ہے۔

میں نے انہیں اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ خیال تھا جب پہنچوں گی تو دونوں گھر ہی پر ملیں گے کیونکہ گاڑی صبح چھ بجے پہنچ جاتی ہے۔ لیکن گاڑی تین گھنٹے لیٹ تھی۔ میں جب گھر پہنچی تو بیدی صاحب دفتر جا چکے تھے۔ نشو گھر پر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر اس کی سسکیاں رونے میں بدل گئیں۔

''دیدی! میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی! یہاں جو ہو رہا ہے میری برداشت سے باہر ہے دیدی! میری مدد کرو دیدی!'' وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ میں پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپا رہی تھی۔

جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکی تو مجھے نہانے دھونے کے لیے کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

فلیٹ کے برآمدے میں بیٹھی، میں نہانے کے بعد بال سکھا رہی تھی اور نشو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے نشو کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ کیسی بدقسمت لڑکی ہے! کتنی بھول ہوگئی ہم سے اس کے لیے لڑکا تلاش کرنے میں! شادی بھی ایک جوا ہوتی ہے۔ قسمت اچھی ہوئی تو گرہستی جنت بن گئی۔ ورنہ دوزخ!

جب بیدی صاحب نشو کے ساتھ ہمارے ہاں آئے تھے تو کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ اس قماش کے آدمی ہیں۔ گھر میں اتنی خوبصورت بیوی ہے اور باہر دل بہلاتے ہیں۔

ناشتے کی میز پر، اور اس کے بعد بھی، نشو بیدی کی بے وفائی کا رونا روتی رہی۔

''تمہیں کیا بتاؤں دیدی! کبھی تو وہ دفتر ہی سے اپنی کسی دوست لڑکی کو ساتھ لیے گھر آتے ہیں اور کبھی ایسی ہی کسی لڑکی کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے کے بعد، کافی دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔ ساتھ آنے والی لڑکی سے مجھے یوں ملائیں گے جیسے میں کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ''یہ ہمارے ہاں، سیلز سیکشن کی انچارج ہیں۔ مس سدھا بھنڈاری''۔ میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے، اپنی اسٹینو کو ہر چھٹی کے دن گھر بلائیں گے۔ اور باہر والے کمرے میں بیٹھے اسے ڈکٹیشن دیتے رہیں گے۔ وہ چڑیل ڈکٹیشن کم لیتی ہے اور مخمور نگاہوں سے ان کے چہرے کی طرف زیادہ دیکھتی ہے۔ اور تو اور، ان کے ساتھ دورے پر باہر جانے میں بھی اسے کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں دیدی! پچھلی بار اسے دورے پر بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اور اب تو وہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ لے جایا کریں گے ـــــ ارے دیدی! میں ان کی فطرت جان گئی ہوں ـــــ اب تم ہی بتاؤں کیا کروں ـــــ؟ کیا کروں میں ـــــ؟''

وہ پھر رو پڑی ـــــ میں نے اسے ڈھارس دی۔

نشو آنکھیں پونچھ کر بولی۔

''اور بتاؤں دیدی! دورے پر جائیں گے دو دن کے لیے کہہ کر اور رہیں گے چار چار، چھ چھ دن اور کبھی آٹھ آٹھ، دس دس دن! اور ایسا جب ہی ہوتا ہے جب وہ الہ آباد جاتے ہیں۔ الہ آباد میں ان کی ایک محبوبہ رہتی ہے۔ ان کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن شادی نہ ہوسکی۔ اس سے اب بھی ناطہ جوڑے ہوئے ہیں۔ اس حرافہ کی شادی بھی ہوگئی ہے لیکن پھر بھی وہ ان سے بے دھڑک ملتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ دیدی! ایسے انسان کے ساتھ میں کیسے نباہ کرسکتی ہوں؟''

اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ'' میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اپنی چیز دوسرے کے قبضے میں چلے جانے کا محض احساس ہی انسان کو کس طرح تڑپا دیتا ہے! وہ سب کچھ بھول جاتا ہے!۔ بہت مشکل سے نشو کا دھیان ان باتوں سے ہٹ سکا۔ اور اسے ماں اور راجی کی یاد آئی ــــــ وہ ماں کی صحت کے بارے میں اور راجی کی تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگی۔ لیکن اس وقت بھی اس کے چہرے پر اس کے دل کا دکھ صاف جھلک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بے دلی سے اٹھی اور رسوئی کی طرف چلی گئی۔

میں سارا دن گھر پر رہی۔ پڑھتی رہی یا سوتی رہی۔ یا بیدی کی آمدنی کا حساب لگاتی رہی۔ چار کمروں کا شاندار فلیٹ قیمتی فرنیچر۔ خوبصورت قالین، دبیز پردے۔ ایرکنڈ یشنر، ٹیلی ویژن اور کار ــــــ یعنی آرام و آسائش کی ہر چیز! لیکن یہ سب چیزیں نشو کے کس کام کی ــــــ؟! یہ سب سامان نشو کو من کی خوشی اور سکون نہیں دے سکتا۔ نشو تو جب خوش ہوتی جب اس کا شوہر اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ وہ کتنی خوبصورت ہے! پھر بھی اپنے شوہر کو اپنے بس میں نہ رکھ سکی۔ اور یہ اس کا سب سے بڑا دکھ ہے!

شام کو جب ملازم نے بیدی صاحب کے دفتر سے لوٹ آنے کی اطلاع دی تو میں نے اپنے اوپر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ بیدی صاحب جب کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے دیکھتے ہیں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے!

''ارے دیدی! تم ــــــ! تم کب آئیں ــــــ؟؟ اپنے آنے کی خبر کیوں نہ دی ــــــ؟ میں اسٹیشن پر ری سیو (Receive) کرنے پہنچ جاتا ــــــ'' ان کے چہرے سے ان کے دل کی خوشی چھلکی پڑتی تھی اور ان کے لہجے سے ان کا خلوص صاف نظر آ رہا تھا ــــــ میں ان کے اس خلوص میں جیسے بہتی چلی گئی۔ نشو کی بتائی ہوئی ساری باتیں میں یکسر بھول گئی! بیدی کے لیے میرے دل میں شروع ہی سے جو ایک نقش سا بن چکا تھا وہ نقش مٹا نہیں تھا۔ اس نقش پر، نشو کے خطوں اور اس کی باتوں کی وجہ سے صرف ایک دھند سی چھا گئی تھی اور وہ دھند بیدی کے خلوص کی گرمی پا کر ایک دم کافور ہو گئی۔

''ارے نہیں بیدی صاحب !میں نے سوچا—— میں سرپرائیز (Surprize) دوں گی۔'' میں نے اسی جذباتی لہجے میں جواب دیا جس لہجے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔

''اچھا! چلو ٹھیک ہے۔اب میں دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لوں گا—— آج کل دفتر میں کوئی خاص کام بھی نہیں ہے۔اور میری تمام کیجول لیو (Casual Leave) باقی پڑی ہے—— چھٹی کا اس سے بہتر استعمال اور کیا ہوسکتا ہے؟ ہم لوگ خوب گھومیں گے۔ دیدی کو شہر دکھائیں گے—— تاج محل—— قلعہ——اعتماد الدولہ—— سکندرہ —— فتح پورسیکری—— فتح پورسیکری تو کل ہی چلیں گے—— کیوں نشو؟ ٹھیک ہے نا۔؟ بھئی، تم کل سویرے ہی کچھ بنا لینا—— ساتھ لے جانے کے لیے—— پک نِک بھی ہوجائے گی!''

لیکن نشو خاموش رہی—— میں نے اس کی خاموشی کی طرف دھیان نہ دیا۔

''ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے بیدی صاحب !میں یہاں پورا ایک ہفتہ رہ سکتی ہوں۔میری بھی کیجول لیو (Casual Leave) کے ابھی آٹھ دن باقی ہیں۔ میں یہاں سے چھٹی بڑھانے کی درخواست دے دوں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بیدی صاحب اچھل پڑے۔

''سچ دیدی ؟تم پورا ایک ہفتہ یہاں رہو گی—— ؟وعدہ کرو—— ملاؤ ہاتھ!''

انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا—— میرے ہاتھ ہی کو پکڑے ہوئے وہ نشو سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھو ڈارلنگ! دیدی کا یہاں ایک ہفتہ کا پروگرام ایسا ونڈرفل ہونا چاہئے کہ ہم سب کے لیے ایک یادگار بن جائے!''

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے الگ کیا اور مسکراتے ہوئے نشو کی

طرف دیکھا۔ نشو اسی طرح خاموش تھی اور اب کی بار میں نشو کی خاموشی کی طرف دھیان دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ نشو کے چہرے پر نہ صرف یہ کہ بیدی صاحب کی معصوم خوشیوں کی کوئی جھلک نہ تھی، اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی بے چینی کے آثار تھے! اور اسی وقت مجھے اچانک یاد آیا کہ میں تو یہاں کسی اور مقصد سے آئی تھی! مجھے تو بیدی صاحب کو ڈرائی فیس (Dry Face) دینا چاہئے تھا۔ میں نشو کی بڑی بہن ہوں۔ اور نشو بیدی صاحب سے خوش نہیں ہے۔ مجھے بیدی صاحب کے سامنے اپنی ناراضگی ظاہر کرنا چاہئے تھی! لیکن بیدی صاحب تو نشو سے بہت محبت سے مخاطب ہو رہے ہیں؟! جیسے ان کا آپس میں کوئی جھگڑا ہی نہ ہوا کوئی لڑائی نہ ہوا ہو سکتا ہے بیدی صاحب یہ سب دکھاوے کے لیے کر رہے ہوں ؟!

وہ پھر نشو سے مخاطب ہوئے۔

''تو ڈارلنگ! آج کا کیا پروگرام بنایا جائے؟''

''ارے؟ آج رہنے دیجئے بیدی صاحب! آج کہیں نہ جائیں گے ـــــ'' میں نے معاملہ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا روکھے پن سے کہا ـــــ لیکن بیدی صاحب نے میرے لہجے کی تبدیلی پر غور نہیں کیا۔ وہ اسی رو میں بولے۔

''اچھا ٹھیک ہے ـــــ آج تم آرام کرو دیدی ـــــ''

ان کے چہرے پر خوشی اسی طرح پھوٹی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد، نوکر نے شام کا ناشتہ لگا دیا۔ ناشتے کی میز پر بھی نشو سنجیدہ بنی رہی۔ بیدی صاحب سے جو بھی اس نے دو چار باتیں کیں بہت مختصر اور تکلف بھرے انداز میں کیں ـــــ لیکن بیدی صاحب پر اس کے اس رویّے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ نشو کی اس عادت کو، اس کے کردار کا ایک حصہ سمجھتے ہوں اور اس کی اس عادت کا اب کوئی برا نہ مانتے ہوں!

تھوڑی دیر بعد وہ بولے ــــــ

''دیدی! جتنے دن تم یہاں رہوگی۔ ہمیں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں کھلاؤ گی ــــــ مسالہ ڈوسہ۔ ایڈلی۔ چھولے بھٹورے ــــــ کباب۔ بریانی۔ تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی تو بہت یاد آتی ہے دیدی ــــــ!'' ''ارے نشو! کیوں نہ آج ڈنر کے لیے بریانی بنائی جائے؟۔ چلو، چل کر سامان لے آئیں ــــــ'' اٹھو! دیدی کو آرام کرنے دو ــــــ ہم تم دونوں بازار سے سامان لے آتے ہیں ــــــ''

وہ ناشتے کی میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے، آپ جائیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ــــــ''نشو نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا۔

''اچھا! ٹھیک ہے ــــــ میں ہی سب سامان لائے دیتا ہوں۔ تم دیدی کے پاس بیٹھو ــــــ''

اور وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں نے دیکھا۔ نشو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے نشو کے ماتھے کو چھوا ــــــ کہیں اسے بخار تو نہیں آگیا ــــــ نشو نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''کچھ نہیں ہے مجھے!'' اور وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ میں حیران و ششدر اسے روتے دیکھنے لگی ــــــ باہر بیدی صاحب کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آرہی تھی۔

وہ روتے ہوئے بولی ــــــ

''میں نے سمجھا تھا تم یہاں میرے زخموں پر پھایا رکھنے آئی ہو ــــــ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ تم بھی......''

میری حیرت میں اضافہ ہوگیا ــــــ یہ کیا کہنا چاہتی ہے؟! میں نے کون سا ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے ــــــ؟!

''کیا ہے نشو ـــــ؟ ہوش کی بات کرو ـــــ'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے لیکن اپنی آواز کو دبا کر کہا ـــــ وہ زور سے چلاتے ہوئے بولی ـــــ

''کیا ہوش کی بات کروں ـــــ؟ جب کسی کی اپنی بہن ہی اس کے مرد پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرے تو ہوش کہاں رہتا ہے ـــــ؟''

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم ـــــ؟'' میں غصہ سے پاگل ہوگئی۔

''بکواس نہیں کر رہی ہوں دیدی! سچ کہہ رہی ہوں ـــــ مہربانی کر کے تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ـــــ اور چلی جاؤ یہاں سے ۔میری گرہستی میں آگ نہ لگاؤ!'' ـــــ

''میں ـــــ میں تمہاری گرہستی میں آگ لگا رہی ہوں ـــــ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم ـــــ؟''

''دیدی !اب زیادہ زبان نہ کھلواؤ۔ مہربانی کر کے تم کل ہی یہاں سے چلی جاؤ ـــــ!''

''کل کیوں ـــــ؟ آج ہی کیوں نہیں ـــــ میں آج ہی رات کی گاڑی سے واپس چلی جاتی ہوں ـــــ ابھی تو وقت ہے گاڑی چھوٹنے میں ـــــ تم جانو ـــــ تمہارا کام ـــــ تمہیں اس بارے میں نہ مجھے کوئی خط لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ماں کو ـــــ سمجھی! میں تو یہاں آنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ یہ تو ماں نے رٹ لگا رکھی تھی۔ کہ تم جاؤ ـــــ جلدی جاؤ۔''

میں اٹھی اور اپنا اٹیچی کیس سنبھالنے لگی۔ نشو نے میرے ہاتھ نہیں پکڑے۔ میں اٹیچی کیس اٹھا کر باہر چل دی۔ نشو نے مجھے نہیں روکا۔

نشو مجھے پھاٹک تک چھوڑنے بھی نہ آئی۔

شام کے دھندلکے میں میں پھاٹک پر کھڑی اس وقت اکیلی اسٹیشن تک جانے میں ہچکچا رہی تھی تو اندر سے نشو کی سسکیاں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ، دور کھڑے رکشا کی طرف چل دی۔

لکھے جو خط تجھے

جب سکریٹری مجھے دعوتی کارڈ دینے آیا تو میں ایک نہایت ضروری نوٹ ڈکٹیٹ (Dictate) کرا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر بغیر اسے دیکھے سامنے قلمدان کے پاس رکھ دیا اور ڈکٹیشن جاری رکھی۔ ''آر۔ای۔سی کے مکھیہ اُدیش ہیں۔ دیش میں گرام وِدھتی کرن پر یوجناؤں کا وِت پوش......'' معاً میری نظر دوبارہ اس لفافے کی طرف گئی۔ ہلکے نیلے رنگ کا ایر میل (Air Mail) لفافہ جو بتا رہا تھا کہ کیلی فورنیا یو۔ایس۔اے سے آیا ہے۔ اس پر ٹائپ کیے ہوئے اپنے پتے ''شری روہن گپتا چیف انجینئر رورل الیکٹریکل کارپوریشن'' کو پڑھنے کے بعد جیسے ہی میری نظر بھیجنے والے کے نام پر پڑی میں نے ڈکٹیشن بیچ ہی میں چھوڑ کر اس لفافے کو اٹھا لیا اور اس میں سے دعوتی کارڈ نکال لیا۔ جب دعوتی کارڈ پڑھا تو میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں چند لمحے اس کارڈ کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ پھر اسٹینو سے کہا۔ ''اس ڈکٹیشن کو ابھی رہنے دو۔ اور جو لے چکے ہو اسے ٹائپ کرلاؤ۔''

اسٹینو کے جانے کے بعد میں نے سر کو کرسی کی بیک پر ٹکا دیا اور دعوتی کارڈ کو دوبارہ پڑھا۔

''شریمتی پریما آپ سے درخواست کرتی ہے کہ آپ اس کی بیٹی اُرمی (رَکٹی) کی

شادی خانہ آبادی میں شرکت کر کے اسے مشکور فرمائیں۔''

پروگرام۔

برات کا سواگت: برمقام ریلوے کلب نئی دہلی ـــــ تاریخ 8/دسمبر 1986ء

وقت: ساڑھے سات بجے شام

پریما ـــــ میری طلاق شدہ بیوی! اُرمی ـــــ میری بیٹی! اُرمی ابھی تک کٹی کے نام سے جانی جاتی ہے! اپنی بیٹی کا نام اُرمی میں نے ہی رکھا تھا اور پیار کا نام کٹی بھی ـــــ کٹی اتنی بڑی ہوگئی کہ اب اس کی شادی ہو رہی ہے!

مجھ سے طلاق پریما نے لی تھی۔ اور آپس میں کیے گئے معاہدے کے مطابق وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ برس کی ہماری بیٹی کٹی کو بھی لے گئی تھی۔ اس وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ جس طرح بھی ہوسکے گا کٹی کے بارے میں مجھے خبر بھجواتی رہے گی چاہے کبھی کبھی اسے خود ہی مجھے خط کیوں نہ لکھنا پڑے۔

طلاق کی ڈگری ملنے کے دو ماہ بعد میں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس وقت میں بجلی کے محکمہ میں اسسٹنٹ انجینئر تھا۔ دو برس تک تو میں نے پریما کا پتہ لگانے کی بھی کوشش نہ کی۔ اور اس نے بھی کوئی خبر نہ بھجوائی۔ پھر پتہ چلا کہ پریما نے دوسری شادی نہیں کی اور ایک فرم میں ایڈورٹائز منٹ اگزیکیوٹیو (Advertisement Executive) کی نوکری کر لی ہے اور آج کل اس فرم کے کیلیفورنیا کے دفتر میں کام کر رہی ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد سنا کہ وہ ہندوستان آئی تھی اپنے ماں باپ سے ملنے لیکن کٹی کو وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اور پھر پتہ چلا کہ کٹی بہت خوبصورت نکل آئی ہے۔ اس وقت اسے دیکھنے کی بہت خواہش ہوئی۔ اور میں خیال ہی خیال اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر پر بوسہ دینے لگتا۔ کٹی کے بارے میں مَیں خود ہی پتہ لگانے کی کوشش کرتا، کچھ ایسے دوستوں سے جن کی پریما کے والدین اور اس کے بھائیوں سے میل

ملاقات تھی ورنہ پریما نے مجھے اب تک کوئی خبر بھجوانے کی کوشش کی تھی نہ وعدے کے مطابق کوئی خط لکھا تھا۔ دوسری شادی سے میری ایک ہی اولاد ہوئی۔ لڑکا ـــــ میری بہت خواہش تھی کہ میری ایک بیٹی بھی ہو جاتی لیکن دوسرا بچہ ہی نہ ہوا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مجھے کٹی کی یاد کبھی کبھی بہت ستانے لگتی! ایک بات بڑی عجیب تھی کہ اگرچہ میں اپنی دوسری بیوی سے خوش تھا لیکن پھر بھی مجھے پریما کے بارے میں کوئی خبر ملتی تو میں بڑے اشتیاق سے یہ خبر سنتا۔ بتانے والے مجھے یہ بھی بتاتے کہ وہ بھی میرے بارے میں سب خبر رکھتی تھی۔ اتنی دور امریکہ میں رہتے ہوئے بھی اسے پتہ چلتا رہا کہ کب میں ڈیپوٹیشن پر رورل الیکٹریکل کارپوریشن میں چلا گیا اور کب وہاں میری ترقی ہوئی اور میں ڈپٹی پروجیکٹ منیجر اور پھر پروجیکٹ منیجر بنا۔ اور کب میں نے لکھنؤ میں کوٹھی خریدی۔ اور پھر اچانک ایک دن مجھے پریما کا خط ملا۔ طلاق کے پورے دس برس بعد۔ یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا اور محض ایک اطلاع نامہ تھا۔ اوپر شری روہن گپتا، پروجیکٹ منیجر رورل الیکٹریکل کارپوریشن لکھا تھا اور نیچے ٹائپ شدہ ''پریما'' کا نام۔ پریما کے ہاتھ کا لکھا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کے دستخط نہ تاریخ۔ خط میں لکھا تھا۔ وہ کٹی کو شروع ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ اُس کے پاپا ہندوستان میں رہتے ہیں۔ کٹی اکثر اپنے پاپا سے ملنے کی ضد کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سمجھ گئی کہ ممی اور پاپا میں طلاق ہو چکی ہے اور اس کے پاپا نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور اب جیسے اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا ہے۔ اس نے پاپا سے ملنے کی ضِد چھوڑ دی ہے لیکن پھر بھی اس نے پاپا کا نام ہمیشہ عزت سے لیا ہے۔ اور اپنے دوستوں کے سامنے پاپا کی تعریف ہی کی ہے۔''

مجھے یہ خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ اگرچہ ایک رسمی سا، مختصر سا ٹائپ کیا ہوا خط تھا لیکن میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ پریما نے وعدے کے مطابق کٹی کے بارے میں لکھا تو سہی۔ چاہے اتنے عرصہ کے بعد لکھا۔ کٹی کے جذبات وخیالات کے بارے

میں جان کر میرا دل چاہنے لگا کہ کٹی کو، اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لوں۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔؟! میں دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کے بعد پھر تقریباً سات سال تک پریما نے مجھے کٹی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں بھجوائی۔ نہ کوئی خبر نہ کوئی خط۔ لیکن ادھر ادھر سے پتہ چلتا رہا کہ کٹی پڑھائی میں بہت ہوشیار ہے اور اب کالج میں پڑھ رہی ہے۔ اس دوران میری ترقی ہوئی اور میں چیف انجینئر کے عہدے تک پہنچ گیا۔ میرا لڑکا بھی انجینئرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ میری مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں لیکن پھر بھی میں اکثر کٹی کو یاد کرتا۔ اور انہی دنوں مجھے پریما کا دوسرا خط ملا اُسی طرح کا مختصر اور اطلاعی خط۔ ٹائپ شدہ۔ اس نے لکھا تھا کہ کٹی گریجویٹ ہو گئی ہے۔ وہ اکثر پاپا کو یاد کرتی ہے۔ اور اتنی بڑی ہو جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو ''ارمی'' کے بجائے ''کٹی'' کہلوانا پسند کرتی ہے۔ اس کی بہت خواہش ہے کہ وہ ہندوستان میں جا کر بسے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کی یہ خواہش پوری ہو سکے گی یا نہیں!''۔ اور میں نے اسی وقت سے یہ امید لگا لی کہ کٹی ہندوستان میں آ کر رہے گی!

وقت گزرتا گیا۔ اور مزید پانچ برس گزر گئے۔ اور ایک دن پھر مجھے پریما کا خط ملا اس کا تیسرا خط۔ بدستور رسمی سا ٹائپ شدہ خط۔ اس نے لکھا تھا۔ ''کٹی سوشالوجی میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہے اور اس کی تھیسس کا موضوع ہے۔ ''وہ بچے جن کے ماں باپ الگ ہو گئے۔'' اپنی تھیسس کے لیے اچھا خاصہ سروے کر ڈالا ہے اس نے۔ اس سلسلے میں وہ ہندوستان بھی آئی تھی۔ میرے ساتھ پورے دو ماہ رہی تھی۔ لیکن میں نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ اسے ہندوستان جب ہی لے چلوں گی جب وہ پاپا سے ملنے کی ضد نہیں کرے گی۔ میں اس کے اندر کسی بھی قسم کی جذباتی کشمکش یا اضطراب پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی تاکہ اس کی تعلیم کا حرج نہ ہو۔ ہندوستان میں بھی اس نے اپنی تھیسس کے لیے خاطر خواہ کام کر لیا تھا۔ کٹی نے اپنے سروے کے دوران دیکھا کہ زیادہ تر بچوں نے اپنے

ماں باپ کو کبھی معاف نہیں کیا لیکن بعض بچے کٹی جیسے بھی تھے جنھوں نے اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں کوسا۔ بلکہ انہوں نے زندگی کو اسی طرح قبول کر لیا جیسی کہ یہ زندگی ہے۔ اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی ترقی کرنے کی کوشش کی۔'' پریما کا خط پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کی کٹی یہاں ہندوستان آئی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا! یعنی پریما نے اپنے والدین کو بھی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کٹی کے وہاں رہنے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ اور واقعی ہمارے مشترکہ دوستوں کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگی!

اور ایک روز مجھے پتہ چلا کہ کٹی کو اپنے تھیسس پر ڈاکٹریٹ مل گئی ہے! کتنی مسرت ہوئی تھی اس روز مجھے! مسرت اور فخر۔ میں کتنے ہی دن اس نشے میں سرشار رہا۔

اور اب ——

کٹی کی شادی کا یہ دعوتی کارڈ ملا ہے! دعوتی کارڈ کے ہمراہ پریما کا چار سطروں کا خط بھی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ کٹی کے لیے اس نے لڑکا ایسا تلاش کیا ہے جو ہندوستان میں مستقل طور پر مقیم ہے۔ وہاں امریکہ میں دو سال کے لیے تعلیم کے سلسلہ میں گیا تھا۔ وہیں پریما نے اسے پسند کر لیا۔ اس خط میں بھی اس کے سابق خطوں کی طرح مجھے ''شری روہن گپتا'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن خط میں شادی میں شرکت کے لیے تاکید بھی کی ہے۔ لکھا ہے۔ ''یہ آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ ضرور آیئے گا۔ ضرور۔''

کٹی شادی کے بعد ہندوستان میں رہے گی۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

جس روز دعوتی کارڈ ملا۔ اس کے پورے ایک ہفتہ بعد کٹی کی شادی تھی۔ میں نے اس دن کے لیے دہلی میں ایک میٹنگ رکھ لی۔ اور اس طرح اسی وقت دہلی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں نے اپنی بیوی گارگی کو نہیں بتایا کہ اس ہفتہ دہلی میں کٹی کی شادی ہے اور میں نے دہلی کا یہ پروگرام صرف کٹی کی شادی میں شرکت کے لیے بنایا ہے۔ حالانکہ گارگی مجھے کٹی کی شادی میں جانے کے لیے کبھی نہ منع کرتی۔ لیکن پھر بھی میں نے اسے

بتانا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنے اس فیصلے کے بارے میں کوئی بھی رائے یا بحھاؤ نہیں سننا چاہتا تھا۔ اپنے خیالات و جذبات پر کسی بھی قسم کا خفیف سا حملہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ گارگی نے ان بائیس برسوں میں مجھے بھرپور پیار دیا تھا۔ اس کے ساتھ اور اپنے بیٹے کے ساتھ میری گھریلو زندگی بہت سکھی تھی۔ گارگی بھی مجھے کبھی کبھی پریما یا کٹی کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر سنایا کرتی جب وہ کہیں سے بھی کچھ سن کر آتی۔ اور اس وقت گرچہ بظاہر میں لاپروائی دکھاتا لیکن اس کی بات کو میں پوری دلچسپی سے سنتا۔ اور سننے کے بعد کئی کئی دن تک متاثر رہتا۔ میں نے اس سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا کہ پریما نے کٹی کے بارے میں مجھے کوئی خط بھی لکھا ہے۔

جب ہمیں دوسرے بچے کی امید نہ رہی تو ایک روز گارگی نے کہا۔

''آپ نے اگر کٹی کو اپنے پاس رکھ لیا ہوتا تو ہمیں بیٹی کی کمی محسوس نہ ہوتی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ پر تم صرف اپنا سوچ رہی ہو۔ پریما کے بارے میں بھی تو سوچو۔ اس کے پاس تو صرف کٹی ہی ہے اس کی محبت اور ممتا کا مرکز۔ اور تمہارے پاس تمہارا بیٹا ہے۔ میں ہوں۔ تمہاری یہ گرہستی ہے۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے کبھی کٹی کو اپنے پاس رکھنے کی بات نہ کی۔

میں نے گیسٹ ہاؤس ہی سے پریما کو فون کر کے مطلع کر دیا کہ میں آ گیا ہوں۔ اور میں بارات کے وقت تک پہنچ جاؤں گا۔ بارات سے پہلے پہنچ کر کرتا بھی کیا۔؟ وہاں ٹھہر تو سکتا نہ تھا۔ پریما سے تو صرف ایک رسمی ملاقات ہی ہونی تھی۔ وہ ملاقات بارات کے وقت ہو جائے گی۔ اور پریما نے بھی فون پر یہی کہا۔

''ٹھیک ہے۔ بارات کے آنے تک ضرور پہنچ جایئے گا۔'' یعنی وہ بھی نہیں چاہتی تھی میں ابھی سے وہاں پر نازل ہو جاؤں۔ ابھی سے میرا وہاں کیا کام۔؟

جب میں وہاں پہنچا تو لوگ کلب کے گیٹ کے پاس اکٹھے ہو رہے تھے۔ بارات

کا سواگت کرنے کے لیے۔ دور سے آتی ہوئی باجوں اور ڈھول کی آواز بارات کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ وہاں کھڑے ایک شخص سے پوچھنے پر پتہ چلا بارات اس وقت یہاں سے تھوڑی ہی دور تھی۔ بس آنے ہی والی تھی۔ میں بھی بھیڑ میں کھڑا ہوگیا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن میں نے اس بھیڑ میں دو تین آدمیوں کو پہچان لیا۔ پریما کے بھائی۔ اس کا ماموں۔ بوڑھے ہو جانے پر بھی ان کے خدوخال پہچان میں آگئے۔ لیکن یہ لوگ مجھے نہیں پہچان پائے۔ یعنی میں کافی بدل گیا تھا!۔ یا شاید اس لیے کہ میری آمد غیر متوقع تھی۔

میں نے ایک طرف کھڑی عورتوں کو غور سے دیکھا۔ اور ان میں سے پریما کو ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ مجھے وہاں پریما نظر نہ آئی۔ یا میں پہچان نہیں پایا! میں نے پیچھے کھڑی ایک چھوٹی سی لڑکی سے پوچھا۔

''بیٹا! لڑکی کی ممی کہاں ہے؟''

''ادھر ـــــ اس کمرے میں ـــــ'' اس نے کلب کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں ہمت کر کے اس کمرے کے اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں کچھ عورتوں کے درمیان کھڑی پریما کو میں نے پہچان لیا۔ اسے پورے بائیس برس کے بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کافی مین ٹین (Maintain) کر رکھا تھا۔ میں ان کے نزدیک جا کر کھڑا ہوگیا۔ ان عورتوں سے وہ الگ ہوئی تو میں اس کے پاس گیا اور ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس لفافے میں اِکاون ہزار روپے کا چیک تھا۔ کٹی کے نام۔ پریما نے میری طرف دیکھا۔ پھر لفافے کی طرف دیکھا اور لفافے پر لکھے میرے نام سے اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔

''او ـــــ آپ؟! میں انتظار کر رہی تھی آپ کا۔''

''کٹی کہاں ہے____؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بغل والے کمرے میں۔ وہ تیار ہو رہی ہے جے مال کے لیے۔ آپ کچھ دیر پہلے آجاتے تو میں اسے آپ سے ملا دیتی۔ اب جے مال کے بعد ملاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ کٹی خوش تو ہے نا۔ اس شادی سے۔؟

''ہاں____ بہت خوش۔''

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی____ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے اپنا اطمینان اور خوشی ظاہر کی۔ پریما میرے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہو۔ لیکن پوچھ نہ پا رہی ہو! شاید میری بیوی میرے لڑکے یا میرے دوسرے گھر والوں کی خیریت پوچھنا چاہ رہی ہو؟! شاید......؟!

''اچھا تو میں باہر جا رہا ہوں۔ بارات کے سواگت کے لیے۔'' میں نے چاہتے ہوئے بھی اس سے نہیں پوچھا کہ وہ اس بائیس برسوں میں کیسے رہی____ پوچھنا بیکار سا لگا____ میں اس کے بارے میں خبر رکھتا ہی رہا تھا۔ اور پھر وہ بھی تو مجھے اطلاع دیتی رہی تھی۔ خط لکھتی رہی تھی۔

بارات آئی____ ڈیڑھ دو سو آدمیوں سے کم نہ تھے۔ مرد بھی۔ عورتیں بھی۔ ان کے پہناوے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکے والے اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں۔ گھوڑی پر بیٹھے لڑکے کو دیکھا۔ گورا چٹا۔ لمبے قد کا تندرست نوجوان لڑکا واقعی بہت خوبصورت تھا۔ میں بہت خوش ہوا۔ ملنی ہونے لگی تو میرا دل چاہا کہ لڑکے کے باپ سے میں ملنی کروں۔ ایک بار دل میں آیا کہ ملنی کے لیے ہاتھوں میں ہار لیے کھڑے ان لوگوں سے کہہ دوں ایک ہار مجھے بھی لا دیں۔ لڑکی کے باپ کی ملنی میں کروں گا۔ لیکن میں جھجک گیا۔ یونہی کھڑا رہا۔ ملنی ہوتے دیکھتا رہا لڑکی کے باپ کی ملنی پریما کے والد نے کی۔ ملنی کے بعد میں کئی چہروں کو پہچاننے لگا تھا لیکن مجھے ابھی تک کوئی نہیں پہچان پایا تھا۔ کسی کو

اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ میری طرف غور سے دیکھے!

جے مال کے وقت کٹی میرے پاس سے گزر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی۔ ہاتھ میں جے مال پکڑے۔ دائیں بائیں چل رہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ۔ یہ میری بیٹی ہے۔ اتنی بڑی ہوگئی! یہی تو ہے جسے میں گود میں لے کر کہا کرتا تھا۔ ''میری دلہنیا بیٹی!'' میں نے من ہی من اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سکھی رہو بیٹی! اور میری آنکھیں بھر آئیں۔ کتنی خوبصورت نکل آئی تھی کٹی۔ ہو بہو پریما۔ جب اس نے میرے گلے میں جے مال ڈالی تھی!

کٹی اس وقت لڑکے کے گلے میں جے مال ڈال رہی تھی۔ اس نے جے مال ڈال دی اور لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ پھر لڑکے نے اس کے گلے میں جے مال ڈال دی اور لوگوں نے پھر تالیاں بجائیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اسٹیج پر بیٹھے لڑکے اور لڑکی کی تصویریں کھینچی جانے لگیں۔ باری باری سب کے ساتھ۔ پھر پریما کو لڑکے والوں کی طرف سے کچھ عورتیں بلانے گئیں لڑکے اور لڑکی کی اس کے ساتھ تصویر کھینچنے کے لیے۔ میں نے چاہا میں بھی بڑھ کر اسٹیج پر جا پہنچوں۔ ان دونوں کے ساتھ تصویر کھینچوانے کے لیے۔ لیکن۔؟ لیکن مجھے پریما نے بھی تو نہیں بلوایا۔ اس وقت تک سوائے پریما کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پریما اسٹیج پر سے اتر آئی۔ اور بھیڑ میں کہیں گم ہوگئی۔

براتی اور گھراتی ڈِنر کے لیے دائیں طرف کے شامیانے میں جانے لگے تو پریما مجھے ایک جگہ کھڑی نظر آئی۔ جہاں وہ کچھ لوگوں کو کھانا کھا کر جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ اس کے پاس پہنچ گیا۔

''میں ــــ میں رکنا چاہتا ہوں۔ پھیروں کے وقت تک۔''

وہ میری طرف اشتیاق سے دیکھنے لگی۔ ''ضرور ــــ ضرور رُکیے'' ــــ اس کی

آنکھوں میں کچھ حیرت بھی تھی ــــــ ''آپ کو تو رُکنا ہی چاہئے۔''

اور میں ایک طرف ایک خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا ــــــ براتیوں کے کھانا کھا چکنے کے بعد ہی میں کھانا کھاؤں گا۔

پھیروں کا وقت چونکہ دس بجے ہی تھا اس لیے منڈپ میں اچھی خاصی رونق تھی۔ اس وقت تک بھی مجھے وہاں پریما کے سوا کوئی نہیں پہچان پایا تھا۔ شاید پریما نے اپنے بہن بھائیوں کو، ماں باپ کو یا کسی بھی رشتہ دار کو میرے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا!

''کنیا دان کا وقت آیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''کنیا دان میں کروں گا۔''

سب لوگ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کچھ کانا پھوسیاں بھی ہوئیں۔ پریما کی نظروں میں پہلے مجھے ناپسندیدگی نظر آئی لیکن پھر اس نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔ اور اٹھ کر کٹی کے پاس آگئی۔ اور بولی۔

''بیٹی! یہ تمہارے پاپا ہیں۔''

کٹی کی نظریں میری طرف اٹھیں اور میرے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ میں بے اختیار سا اس کے پاس گیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کا لمس! اتنے عرصہ کے بعد اس کے منہ سے بہت ہی میٹھے سروں میں نکلا۔

''پاپا ــــــ'' اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور اس وقت وہ مجھے ڈیڑھ برس کی کٹی دکھائی دینے لگی جب کٹی کو لے کر پریما چلی گئی تھی۔

اب میں منڈپ میں اپنے آپ کو اکیلا نہیں محسوس کر رہا تھا۔ کنیا دان کے بعد کی رسموں میں میں نے باقاعدہ حصّہ لیا میں نے محسوس کیا کٹی اور پریما دونوں ہی کچھ زیادہ چست، کچھ زیادہ مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔

شادی ہو جانے کے بعد ڈولی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پریما کے بھائی بہن میرے پاس آکر رسمی طور پر سلام دعا کر چکے تھے اور میں بھی اس کے والدین کو نمسکار کر چکا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کے چہروں پر مجھے ناگواری ہی کا تاثر نظر آیا تھا۔

ودائی کے وقت سب سے ملانے کے بعد پریما کٹی کو لے کر میرے پاس آئی۔ اور جب اس کا سر اپنے سینے پر ٹکا کر میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے تو وہ بولی۔

''پاپا! میں آپ سے ملی بھی تو کب ـــــ جب اس گھر کے لیے پرائی ہو رہی ہوں۔''

''نہیں بیٹا! تم تو ہندوستان میں رہوگی۔ اور اب شادی کے بعد تمہاری ساری ذمہ داری تمہارے پاپا ہی تو نبھائیں گے۔'' پریما نے میری طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے اپنا وعدہ بھی پورا نہ کیا۔ اور آپ کو کٹی کے بارے میں کبھی خط ہی نہ لکھا۔''

''ارے! نہیں تو ـــــ تمہاری طرف سے تو مجھے چار خط ملے تھے۔''

''میری طرف سے خط ـــــ ؟!''

''ہاں ـــــ اور کیا ـــــ وہ تمہارے خط ہی تو تھے۔ بھلے ہی ٹائپ کیے ہوئے رسمی خط تھے۔''

''لیکن میں نے تو ایسا کوئی خط نہیں لکھا تھا۔'' پریما حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی ـــــ کٹی نے اسی وقت سر اوپر اٹھایا ـــــ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''پاپا!'' اور پھر پریما کی طرف دیکھا ـــــ ''ممی! ......'' اور اس کی روتی ہوئی آنکھیں مسکرا اٹھیں!

بندھن

اودے پور آنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس شہر سے میری ایک تلخ یاد وابستہ تھی۔ میں نے یہاں محبت کی تھی۔ سات برس پہلے۔ شادی کے لیے عہد و پیمان بھی کیے تھے۔ جیون بھر ساتھ رہنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ لیکن اودے پور کے ایک ماہ کے قیام کے بعد آگرہ واپس آتے ہی جیسے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ قسمیں وعدے سب کچھ۔

میرے اودے پور سے آنے سے پہلے پتا جی نے ایک جگہ میری سگائی کی بات چلا رکھی تھی۔ اور لڑکی کو دیکھ کر میں نے بھی ہاں کر دی تھی۔ لیکن سگائی کی رسم سے پہلے مجھے ایک ہینڈی کریفٹس بنانے کی کمپنی میں سیلز ایگزیکٹو کی تقرری کے سلسلے میں ایک ماہ کی ٹریننگ کے لیے اودے پور آنا پڑا تھا۔ میرے وہاں سے لوٹنے کے بعد ہی سگائی کی باقاعدہ رسم ہونا تھی۔ ادے پور میں میں اس کمپنی کی ایک آفس اسسٹنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہو گیا۔

کنک کو میں نے شادی کے لیے پسند کیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد میرے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ لیکن شوانگنی کو دیکھتے ہی میرے دل میں ایک میٹھا سا درد ہوا تھا۔ اور میرے کانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ لڑکی تو نہ جانے کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی! ہاں۔ یہی لڑکی میری جیون ساتھی بنے گی۔ شوانگنی نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔

شوانگنی سے اظہار محبت کے بعد میں دو ہفتے وہاں رہا۔ ہم دونوں کئی جگہ اکٹھے گھومتے پھرے۔ لیک پلیس۔ سٹی پلیس۔ سہیلیوں کی باڑی۔ گلاب باغ فتح ساگر جھیل اور اس کے بیچ بنا نہرو پارک اور بھی کئی جگہیں۔ اور ان سب جگہوں پر وہ میری گائیڈ بنی میرے ساتھ رہی تھی۔ اور ایک بار میں اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گیا تھا۔ اس نے اپنے ممی پاپا سے میرا تعارف کمپنی کے ایک افسر کے طور پر کرایا تھا۔ میں نے ان سے شوانگنی کا ہاتھ نہیں مانگا۔ میں نے سوچا بلکہ ہم دونوں ہی نے یہ طے کیا کہ میں اپنے گھر میں بات کرنے کے بعد اپنے ماں باپ کو رشتے کے لیے اودے پور لے آؤں گا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ممی پاپا میری بات مان جائیں گے۔ اور سگائی کی جو بات میرے اودے پور آنے سے پہلے چلی تھی وہ وہیں ختم کر دیں گے۔

وداعی کے وقت شوانگنی کی آنکھیں چھلک آئیں۔

اور جب میں نے اس سے کہا......

''ارے! بیکار میں رو رہی ہو۔ میں بہت جلد واپس آ رہا ہوں۔'' تو وہ بولی تھی۔

''نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم کبھی نہ مل پائیں گے......کبھی نہیں۔'' اور پھر اس نے خود ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ اور لبوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔ لیکن اس کی اس اداسی سے میں بھی اداس ہو گیا تھا۔

جب میں آگرے پہنچا۔ تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری سگائی کی باقاعدہ رسم میرے گھر پہنچنے کے دوسرے ہی دن کے لیے طے پا چکی تھی۔ اور دعوتی کارڈ بھی تقسیم کیے جا چکے تھے۔ مجھے وہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ میرے آگرے سے اودے پور آنے کے دو ہی دن بعد پاپا کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور وہ تقریباً تین ہفتے ہسپتال میں داخل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی بیماری کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ میں فکر نہ کروں اور میری ٹریننگ میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ ہسپتال سے واپس آتے ہی انہوں نے میری سگائی کی

تاریخ طے کر دی تھی ۔ میرے آگرے پہنچنے کے دوسرے دن کی تاریخ ۔ وہ مجھے بہت کمزور دکھائی دیئے ۔ میری سگائی کی خوشی ان کے زرد چہرے پر کچھ رونق لے آئی تھی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں انہیں اس سگائی کو منسوخ کرنے کے لیے کہہ کر ان کے چہرے کی یہ رونق ان سے چھین لوں۔ کچھ دنوں کا وقفہ مل جاتا تو شاید میں ہمت کر بھی لیتا۔ لیکن یہ تو میرے وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی دن کا پروگرام تھا۔ سگائی کی رسم ہوگئی۔ اور کنک نے جیسے اس رسم میں ہی شوانگنی کو مجھ سے بہت دور دھکیل دیا۔ انگوٹھی کی رسم میں میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا میری انگلی میں انگوٹھی پہنانا اور اسی طرح میرا اس کی انگلی میں۔ پھر اس کا میرے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا رکھنا اور میرا اس کے منہ میں۔ اور اس کے بعد ہم دونوں کا سگے سمبندھیوں سے آشیر واد لینا۔ مجھے یوں لگا جیسے شوانگنی دور کھڑی یہ سب دیکھ رہی ہو! حسرت بھری نگاہوں سے! وداع کے وقت کے اس کے یہ الفاظ۔ '' مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم کبھی نہ مل پائیں گے۔ کبھی نہیں ____ '' میرے کانوں میں گونجنے لگتے اور میں دل کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگتا۔

پاپا کی بیماری کی وجہ سے سگائی کے ایک ہفتہ بعد میری شادی بھی ہوگئی ____ اور میں سچ مچ شوانگنی کو بھول گیا۔ کنک نے مجھے مکمل طور پر جیت لیا تھا۔ اپنی محبت سے، اپنی سیرت سے، اپنی سادگی سے، اپنی معصومیت سے، اپنی خدمت سے اپنے خلوص سے اور میرے ساتھ لڑنے جھگڑنے سے۔ اور اب تو میں ایک بچے کا باپ ہوں اور وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اسے اس کے دادا دادی کے پاس چھوڑ کر ہم دونوں دس پندرہ دن کے لیے کہیں بھی آجا سکتے ہیں۔ اور اب ہم اکثر آگرے سے باہر کسی نہ کسی شہر گھومنے چلے جایا کرتے ہیں۔ اس لیے جب میں کنک کے ساتھ اس کے بڑے بھائی کے بیٹے کی شادی میں اندور آیا تو اس کے اصرار پر اودے پور چلنے کے لیے بھی تیار ہوگیا۔ حالاں کہ اودے پور آنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کنک کا ایک بھائی اودے پور میں ہندوستان زنک لمیٹڈ میں فورمین ہے اور اسے زنک سمیلٹر کالونی ڈیباری میں بہت اچھا مکان ملا ہوا ہے۔ وہ بھی بمعہ بیوی بچوں کے اندور میں اس شادی میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ کئی بار لکھ چکا تھا کہ ہم چند روز اس کے پاس اودے پور میں آکر رہیں۔ لیکن اس وقت اندور میں شادی کے بعد وہ بیوی بچوں سمیت چار پانچ روز کے لیے بھوپال جا رہا تھا اس نے خود اپنی طرف سے تو ہمیں اودے پور چلنے کی دعوت نہیں دی۔ لیکن جب اس نے کنک کی خواہش دیکھی تو اس نے اپنے گھر کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں اور بولا۔ ''دیدی۔ آپ چلیے نا اودے پور۔ ہمارے گھر جا کر رہیے۔ چار پانچ روز کے بعد تو ہم وہاں آہی جائیں گے۔ گھر میں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ وہیں پکایئے کھایئے۔ گھر بند کر کے ضرور آئے ہیں لیکن آپ کو وہاں سب کچھ سلیقے سے رکھا ملے گا بس تھوڑی سی صفائی کی ضرورت ہوگی۔ یہ چابی پھاٹک کی ہے۔ یہ مین ڈور کی۔ اور یہ اسٹور روم کی ۔اور یہ کچن کی۔ بیڈ روم دونوں کھلے ہیں۔ دونوں میں جو زیادہ آرام دہ لگے۔ آپ لوگ اس میں رہیے گا۔ گیلری میں اسکوٹر پڑا ہے۔اور یہ اسکوٹر کی چابی ہے۔''

ان کے گھر میں ان کی غیر حاضری میں ہم دونوں جا کر رہیں۔ یہ بھاؤ کنک کو ہی نہیں مجھے بھی رومانٹک لگا۔ اودے پور میں اگر ہم کبھی آتے بھی تو ان ہی کے یہاں ٹھہرتے۔ لیکن اس وقت ہمیں اپنے میزبان کی سہولت اور آرام کا خیال کر کے رہنا پڑتا۔ اور اپنی آزادی کی تھوڑی سی قربانی بھی دینا پڑتی۔ لیکن اب ان کی غیر حاضری میں تو ہم ہی گھر کے مالک ہوں گے۔ ہمیں گھر کا سا آرام ملے گا اور کسی گیسٹ ہاؤس کی سی آزادی بھی۔ جب چاہیں گے سوئیں گے۔ جب چاہیں گے جاگیں گے۔ جب چاہیں گے باہر گھومنے جائیں گے۔ جب چاہیں کے لوٹیں گے۔

جب کنک نے چابیاں لے لیں تو اس کا بھائی بولا۔

''بغل کے مکان والے ویاس صاحب فیکٹری میں میرے ساتھی فورمین ہیں اور ان سے ہماری بہت دوستی ہے۔ بہت آنا جانا ہے۔ دیدی! یوں سمجھ لو کہ وہ بھی تمہارا بھائی ہے۔ میں چٹھی دے دیتا ہوں اس کے نام۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو۔ وہاں سے لے لینا۔ ہم دونوں کے گھروں میں چوکا برتن اور صفائی کرنے والی بائی بھی ایک ہی ہے وہ اسے کام کے لیے بھی کہہ دیں گے۔ اور آپ کو ان لوگوں کی کمپنی بھی رہے گی۔''

اور اس نے چٹھی لکھ دی۔ اور ہم اودے پور چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن دل کے ایک کونے میں شوانگنی کے ساتھ کی گئی بے وفائی کا جو درد سا کبھی اٹھا کرتا تھا اب پھر عود کر آیا۔ اور عجیب بات تو یہ تھی کہ میں اودے پور اسی اگست کے مہینے میں جا رہا تھا جس مہینے میں سات برس پہلے شوانگنی سے رخصت ہوا تھا!

اودے پور میں زنک سمیلٹر کالونی میں پہنچنے کے بعد کنک کے بھائی کا مکان بہت جلد مل گیا۔ اور مکان میں ہم لوگ داخل بھی ہو گئے۔

نہانے دھونے کے بعد کنک کچن میں گھس گئی۔ اس نے آٹا نکال کر گوندھا۔ اور ارہر کی دال پکانے کے لیے گیس پر رکھ دی لیکن دال ابھی پکی نہیں تھی کہ گیس ختم ہو گئی۔

''اب تم اس کو وہیں رہنے دو۔ باسکٹ میں تھوڑے سے پھل ہیں۔ وہی کھا لیتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد شہر چلیں گے۔ وہاں کھانا کھا لیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر وہ جو پڑوس میں رہنے والے ویاس صاحب کے نام خط ہے وہ کیوں نہ ابھی استعمال کر لیا جائے۔' چلیے ان سے مل لیتے ہیں۔ ان کے پاس شاید گیس سلنڈر فالتو ہو۔''

میں نے سوچا تھا کہ ان لوگوں سے شام کو ملیں گے ــــــ لیکن کنک کی یہ تجویز مجھے مناسب لگی اور ہم لوگ اسی وقت خط لے کر ویاس صاحب کے یہاں پہنچ گئے ــــــ گھنٹی بجانے پر جس عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ بہت ہی جانی پہچانی سی لگی۔

''مسز ویاس؟''

''جی ___ '' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تو جیسے میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔

''شوانگنی تم۔؟''

لیکن یہ الفاظ میرے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ کنک کے ہاتھ سے لیا ہوا خط پڑھ رہی تھی۔ اور میں اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اور سانس جیسے رک سی رہی تھی۔

اس کی مانگ میں سیندور اور گلے میں پڑے منگل سوتر نے جیسے مجھے سہارا دے دیا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس نے بھی شادی کر لی۔

''آیئے ___ اندر آیئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کنوجیہ صاحب کا مکان کھلا دیکھا تو سمجھی وہ لوگ اندور سے ہی واپس آ گئے۔'' یہ جملہ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا ___ اس نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟

ہم لوگ اندران کے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

''وہ لوگ تو شاید آج اندور سے بھوپال جائیں گے ___ کیوں؟''

''جی ___ بھوپال میں چار پانچ روز رہنے کے بعد یہاں آئیں گے۔''

کنک نے جواب دیا۔

مسز ویاس یہ کہہ کر کہ ''میں چائے کا پانی رکھ آؤں۔'' کچن کی طرف چلی گئی۔ کنک بھی اس کے ساتھ یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی ___ ''ارے دیدی آپ چائے رہنے دیجئے۔ میں آٹا گوندھ کے رکھ آئی ہوں۔ دال بھی چڑھائی تھی لیکن گیس ختم ہو گئی ___ اگر آپ کے پاس ایک گیس سلنڈر فالتو ہو تو دے دیجئے۔''

''ارے واہ ___ ! آپ آتے ہی کھانا پکائیں گی۔ نہیں بھئی یہ نہیں ہوگا ___

کھانا تو آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گے—— بلکہ جب تک وہ لوگ نہیں آجاتے ۔کھانا آپ ہمارے یہاں ہی کھایئے۔''

''ارے نہیں دیدی—— میں تو آٹا گوندھ کر آئی ہوں۔ سچ!''

''تو کوئی بات نہیں—— گوندھا ہوا آٹا ہم یہاں منگوالیں گے۔''

اُن ساری باتوں کے دوران اس نے دو تین بار میری طرف دیکھا۔لیکن بڑی بے تعلقی کے ساتھ۔ اس کی نظروں سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا۔ سات برس کے عرصہ بھی تو کافی لمبا عرصہ ہوتا ہے۔اور میں کچھ بھاری بھی ہو گیا ہوں۔اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پہچان لیا ہو اور ظاہر نہ کرنا چاہتی ہو؟

یہ سوچ کر مجھے کچھ عجیب سی بے چینی ہوئی۔

وہ چائے بنالائی اور چائے پینے کے دوران وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے کنک کی طرح مجھے بھی پہلی بار مل رہی ہو—— ہم لوگ تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ ویاس صاحب کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ ایک بجے آئیں گے لنچ کے لیے—— اس وقت گیارہ بجے تھے—— ہم لوگ دو گھنٹے کے بعد آنے کے لیے کہہ کر واپس اپنے گھر آ گئے۔

گھر آنے پر کنک تو آرام کرنے کے لیے بیڈ پر لیٹتے ہی سو گئی—— لیکن مجھے اس کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک پل یاد آنے لگا—— وداع کے وقت اس کا آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنا اور کہنا—— ''نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم کبھی نہ مل پائیں گے۔کبھی نہیں——'' میرے کانوں میں زور زور سے سنائی دینے لگا—— ''ہم کبھی نہ مل پائیں گے۔کبھی نہیں۔ہم کبھی نہ مل پائیں گے۔کبھی نہیں۔''اور میں تڑپ اٹھا۔

تقریباً ایک بجے ہم لوگ ویاس صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔ ویاس صاحب سے

مل کر طبیعت واقعی ہلکی ہوگئی ـــــــ وہ بہت خوش مزاج انسان ہیں۔ چٹکلے سنانے کے فن میں ماہر ـــــــ ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں پرانی دوستی ہو ـــــــ ان کی یہ خوش مزاجی مجھے بہت راس آئی ـــــــ اور شوانگنی تو جیسے ان کی بھگت تھی۔

''آپ ان کو وہ سنائیے نا۔ وہ شرابی والا جوک۔''

''ارے واہ! یہ جوک تو میں نے بھی نہیں سنا تھا۔''

''اجی یہ جوک کہاں تھا۔ یہ تو ان کے ایک اسسٹنٹ کے بارے میں سچا واقعہ ہے سو فیصد سچا۔''

وہ چٹکلوں کے لیے ہی نہیں ہر بات میں ان کی تعریف کرتی۔ اور یہ دیکھ کر کبھی مجھے تسلی ہوتی کہ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش ہے۔ اور کبھی مجھے جلن سی محسوس ہونے لگتی۔ ایسی بھی کیا پتی ورتا کے مجھے بالکل ہی بھول گئی۔

کھانا کھانے کے بعد ہم اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ ویاس صاحب فیکٹری واپس نہیں چلے گئے۔ شام کے لیے ہم نے منع کر دیا۔ شام کو گھومنے جائیں گے تو وہیں کسی ریسٹورنٹ میں کھا پی لیں گے۔ اور انہوں نے اصرار بھی نہیں کیا۔

اس کے بعد چار دن ہم نے کنک کے بھائی اور بھابی کی غیر حاضری میں وہاں گزارے اور ان چار دنوں میں کبھی صبح یا شام کا ناشتہ اور کبھی دوپہر کا یا رات کا کھانا ان کے یہاں کھایا۔ اس طرح روزانہ ایک یا دو بار ان کے ساتھ وقت گزرا۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔

وہ تمام دن گھر پر ہی رہتی تھی ـــــــ یعنی اس نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی یا پھر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں اس کی ملازمت کے بارے میں بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ بیٹا۔ اور وہ سندیا کالج گوالیار میں پڑھتا تھا۔

کنک کے بھائی اور بھابی کے آنے کے بعد بھی ہم چار دن وہاں رہے۔ لیکن ان

چار دنوں میں میں ان کے یہاں نہیں گیا۔ اب میں پہچانے جانے کا مزید خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا___ ہاں البتہ کنک اس سے ملنے روزانہ ان کے یہاں جاتی رہی۔ اور جب بھی ان کے یہاں سے آتی مسز ویاس کی تعریفیں ہی کرتی۔

ہماری واپسی کا دن تھا۔ اور گاڑی کی روانگی کا وقت ساڑھے گیارہ بجے دن کا تھا۔ روانگی سے تقریباً دو گھنٹے پہلے کنک مسز ویاس سے ملنے گئی۔ تو جیسے ان کے یہاں بیٹھ ہی گئی۔ اس کی چھوٹی موٹی پیکنگ ابھی باقی تھی۔ مجھے بھابی کو بھیج کر اسے بلوانا پڑا۔

جب وہ ان کے یہاں سے آئی تو بہت اداس تھی۔

''کیوں کیا بات ہے۔ بڑی اداس لگ رہی ہو۔؟''

''ہاں۔ پھر بتاؤں گی۔''

اور وہ سامان پیک کرنے لگی۔ میں نے بھی اس سے اس وقت پوچھنا مناسب نہیں سمجھا___

گاڑی کے چھوٹنے کے بعد جب ہم دونوں اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو میں نے کنک سے پوچھا۔

''اب بتاؤ کیا بات تھی۔؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر بولی۔

''آج مسز ویاس بہت بے چین تھی۔ بہت اداس___ جب میں گئی تو یوں لگا جیسے ابھی ابھی رو کر اٹھی ہو۔''

''کیوں___؟ کیا بات تھی۔؟'' میں حیران بھی ہوا اور بے چین بھی۔

''آج سے سات برس پہلے، آج ہی کے دن یعنی دس اگست کو اس کی جڑواں بہن چل بسی تھی۔''

''جڑواں بہن؟''

''جی ۔مسز ویاس نے بتایا کہ وہ خود تو جے پور میں مہارانی گرلز کالج میں پڑھتی تھی لیکن اس کی جڑواں بہن یہاں اودے پور میں والدین کے ساتھ رہتی تھی ۔ اور ملازمت کرتی تھی ۔مسز ویاس ایک ہی دن پہلے چھٹی میں گھر آئی تھی ۔ اگلے دن صبح نو بجے اس کی بہن حسب معمول اسکوٹر پر دفتر گئی۔لیکن وہ دفتر نہ پہنچ سکی۔ راستے میں ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ ایک تیز رفتار ٹرک نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اور مسز ویاس اپنی بہن کو نہیں اس کی لاش کو دیکھ سکی۔ وہ دس اگست کا دن تھا____ اور اب مسز ویاس ہر دس اگست کو بے چین ہو جاتی ہے ۔اداس ہو جاتی ہے ۔اسے اپنی بہن کی خون میں لت پت وہ شکل یاد آ جاتی ہے۔''

کنک اس کی اداسی کی وجہ بتاتے ہوئے خود بھی اداس ہوگئی تھی ۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ ہماری سگائی دس اگست کی شام کو ہوئی تھی ۔ شوانگی تو سگائی سے کئی گھنٹے پہلے مجھے اپنے وعدوں کے بندھن سے آزاد کر چکی تھی ۔ اور میں......

چتا کی قیمت

ماں بیمار ہے ـــــ اسّی برس کی بڑھیا ـــــ مجھے بھائی صاحب کا خط ملا ہے لکھا ہے۔ ماں کی حالت تشویشناک ہے۔ میں نے دفتر سے ایک مہینہ کی چھٹی لے لی ہے۔ بچوں کے اسکولوں میں بھی گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ میں بیوی بچوں سمیت بھائی صاحب کے ہاں چلا آیا ہوں۔ ماں کی تیمارداری کے لیے! جب پہنچا ہوں تو ماں کو بستر پر پڑے دیکھا ہے۔ اور مجھے افسوس ہوا ہے کہ اب ماں بچے گی نہیں! ـــــ پاس بیٹھی میری بہن نے ذرا اونچی آواز میں کہا ہے ـــــ ''ماں! جگدیش آیا ہے ـــــ جگدیش ـــــ''

اور ماں نے پیار سے میری پیٹھ پر، میرے سر پر اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیرے ہیں۔ اپنے لرزتے ہوئے، کمزور بازوؤں سے، میرے سر کو اپنی طرف کھینچ کر اپنے سینہ سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر لیٹے لیٹے اس نے اپنے ہونٹ میری پیشانی پر لگادیے ہیں ـــــ اور میری آنکھیں نم ہوگئی ہیں۔

''کیسی ہو ماں ـــــ؟''

جواب میں اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے ہیں ـــــ وہ بولی نہیں ـــــ وہ بول نہیں سکتی ـــــ تھوڑا سن سکتی ـــــ کچھ دیکھ بھی سکتی ہے ـــــ اس کی چھوٹی چھوٹی، دھندلی سی آنکھوں میں دل کا سارا پیار اُمڈ آنے کی وجہ سے آنکھوں کے ارد گرد سکڑا

ہوا گوشت کچھ ابھر سا آیا ہے۔ میں اس کے پاس ہی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا ہوں۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس کی نبض دیکھنے کے بہانے ــــ مجھے اس کی نبض کسی کسی وقت ڈوبتی سی محسوس ہوتی ہے۔

وہ بے جان سی آنکھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہیں ــــ اب میرا کیا حال ہونا ہے بیٹا ــــ؟ اور وہ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو جاتی ہیں ــــ ماں پر غنودگی کا دورہ پڑ گیا ہے ــــ بھائی صاحب نے مجھے بتایا ہے ــــ وہ اکثر اسی طرح نیم بے ہوش سی پڑی رہتی ہے ــــ گھنٹوں اسی طرح پڑی رہتی ہے ــــ ڈاکٹروں کا کہنا ہے اب یہ چند روز کی مہمان ہے!

جب میں پچھلی بار آیا تھا ــــ تو ماں اٹک اٹک کر بول سکتی تھی۔ اس کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن میری بڑی بہن اس کی بات سمجھ جاتی تھی ــــ میری بڑی بہن جو بیوہ ہے مدت سے ماں کے پاس رہ رہی ہے۔ اس کی سیوا کرتی رہتی ہے۔ جب ماں نے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کچھ کہا۔ تو میں سمجھا نہیں۔ بہن نے بتایا کہہ رہی ہے۔ ''ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔ یہ درد کی گولی نہیں دیتی۔'' اور پھر بہن بولی۔ ''کیا کروں! ڈاکٹر نے زیادہ گولیاں دینے سے منع کر رکھا ہے ــــ دن میں صرف دو یا تین بار ــــ بس ــــ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے، اسے دوسری گولی دے چکی ہوں ــــ اور ابھی تمام دن باقی ہے۔ ساری رات گزارنی ہے۔

میں نے کہا ــــ ''دیدو بہن۔ دے دو دوا۔ درد بھی تو برداشت نہیں ہوتا۔''

اور بہن نے اسے درد کی گولی دیدی۔ ماں نے مشکور نظروں سے مجھے دیکھا۔ مجھے اب تک ماں کی وہ نگاہیں یاد ہیں ــــ یہ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ اور اب ماں بول ہی نہیں سکتی! اور شاید اسے درد بھی نہیں ہوتا! کون جانے؟!

ہم لوگوں نے آپس میں ڈیوٹی بانٹ رکھی ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ماں کے پاس

ضرور رہتا ہے ـــــ ایسا نہ ہو کہ ماں دم توڑ دے اور کوئی پاس ہی نہ ہو! اس وقت ہمیں اس کے زندہ رہنے کی نہیں مرنے کی زیادہ فکر ہے۔ اور اس وقت میں ماں کے پاس بیٹھا ہوں۔ میری آنکھیں اس کے جھریوں بھرے چہرے پر مرکوز ہیں اس چہرے میں سے اچانک ایک دھندلا سا چہرہ ابھرآتا ہے۔ یہ ماں کا اس وقت کا چہرہ ہے۔ جب میں کوئی چار سال کا تھا۔ اس سے پہلے کا ماں کا چہرہ مجھے یاد نہیں۔ ماں نے مجھے کندھے سے لگا رکھا ہے۔ اور میری پیٹھ تھپتھپا رہی ہے۔ اور گلی میں کھڑی ایک عورت سے باتیں کر رہی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ چہرہ تھوڑا صاف نظر آنے لگتا ہے ـــــ سانولے رنگ کا بھرا بھرا سا گول چہرہ ـــــ ناک میں سفید نگ کی کیل ـــــ اب میں اسکول میں پہلی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ اسکول سے آنے کے بعد، کبھی ماں مجھے خود اپنے سینہ سے لگا کر بھینچ لیتی ہے اور کبھی میں ہی اس کے گلے میں جھول جاتا ہوں۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اس لیے ماں مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے ـــــ اب مجھے وہی چہرہ غصہ سے لال ہوتا نظر آتا ہے ـــــ ماں ہم میں سے کسی کو کسی بات پر ڈانٹ رہی ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے۔ میں اسکول سے لوٹا ہوں ماں غسل خانے میں نہا رہی ہے۔ ماں نے ذرا سا دروازہ کھول کر مجھے بتایا ہے کہ کھانا کہاں رکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ ماں کے چکنے سانولے بدن پر پانی کی لکیریں پھسل رہی ہیں۔ جیسے میری بہن کی ربڑ کی گڑیا کے جسم پر پانی پھسل پھسل جاتا ہے۔ اس پر ٹھہرتا نہیں میرا دل چاہتا میں وہیں کھڑا ماں کو دیکھتا رہوں ـــــ کتنی پیاری ہے ماں! ـــــ

''جانا بیٹا ـــــ رسوئی میں روٹی پڑی ہے۔ تھالی سے ڈھکی۔ جا کھالے جا کے ـــــ''

پھر اچانک مجھے یاد آتا ہے۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ ماں کے بالوں میں اب کہیں کہیں سفید بال نظر آتے ہیں۔ چہرے پر بھی جھریاں نظر آتی ہیں۔ دس سال اور بیت جاتے ہیں۔ ماں میرا ماتھا چوم رہی ہے۔ جو سہرے کے پھولوں سے ڈھکا ہے۔

پھلوں کی اوٹ میں سے مجھے ماں کا چہرہ خوشی سے تمتماتا نظر آتا ہے۔ لیکن وہ چہرہ اب پوری طرح جھریوں سے بھر گیا ہے۔ سر میں بھی اب سفید بالوں کی لٹیں نظر آتی ہیں۔ یہ سر سفید ہوتا جا رہا ہے۔ بال کم اور چھوٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چہرے پر جھریاں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ جب بھی میں دفتر سے چھٹی لے کر بھائی صاحب کے ہاں آیا ہوں۔ یا جب بھی ماں میرے پاس آئی ہے مجھے ماں کا چہرہ پہلے سے بوڑھا دکھائی دیا ہے______

ماں میرے سامنے بستر پر پڑی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ چہرے سے ہٹ کر میری نگاہ ماں کے بالوں پر پڑتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سفید بال ایک کالے رنگ کی میلی سی چوٹی کے ساتھ بندھے ہیں۔ اور اس چوٹی میں ایک چھوٹی سی پیتل کی چابی بندھی ہے۔ یہ ماں کے ٹرنک کی چابی ہے۔ ماں ہمیشہ اپنے ٹرنک کو خود کھولتی ہے اور اب جب سے ماں بستر پر پڑی ہے اس کا ٹرنک نہیں کھلا۔ اس نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ اس کا ٹرنک کوئی نہ کھولے اس لیے کسی کو اس کا ٹرنک کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنے دل میں سب ہی نے سوچ رکھا ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی ٹرنک کھولیں گے______ گھر کے چھوٹے بچوں نے تو کئی بار آپس میں باتیں بھی کی ہیں۔ ''نانی اماں کے ٹرنک میں بہت سے نوٹ پڑے ہیں______ ہاں۔''

''دادی اماں کے پاس بہت سا سونا ہے۔ جو اس نے ٹرنک میں چھپا رکھا ہے۔''

لیکن ماں کے ٹرنک میں رکھا ہی کیا ہوگا______؟! جو روپے اسے ہم بھائیوں سے وقتاً فوقتاً خرچ کے لیے ملتے رہے ہیں۔ ان روپیوں میں سے تو وہ ہر تہوار پر اپنے دوہتے دوہتیوں، پوتے پوتیوں کو کچھ نہ کچھ دیتی رہی ہے۔ جو گہنے اس کے پاس تھے اس میں سے اس نے ہماری کسی لڑکی کو اس کے سسرال جاتے وقت کوئی نہ کوئی گہنا بنوا دیا ہے۔ یعنی ہمارے ہی بچوں پر اس نے اپنے روپے اپنے گہنے سب خرچ کر دیئے ہیں۔ اب اس کے پاس کیا رکھا ہوگا۔؟!

ہم ڈیوٹیاں بدلتے رہتے ہیں۔ دن گزرتے جاتے ہیں اور میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ لیکن ماں کی حالت اب بھی ویسی ہی ہے۔ میں بے چین سا ہونے لگتا ہوں۔ ماں تو مری نہیں اور میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں! مجھے دوبارہ آنا پڑے گا کیا ــــــ؟! مزاج پرسی کے لیے۔ آنے والے لوگ اکثر کہہ اٹھتے ہیں ــــــ ''بڑھیا کی جان جانے کس میں اٹکی پڑی ہے ــــــ اب بے چاری کے بچنے کا کوئی امکان تو ہے نہیں!'' انہی میں سے کوئی مشورہ دیتا ہے ــــــ '' گیتا پاٹھ کیجئے اس کے سرہانے۔''

......شری کرشن مہاراج نے ارجن سے کہا۔ ''اے ارجن! واستو میں نہ تو ایسا ہے کہ میں کسی کال میں نہیں تھا۔ اتھوا تو نہیں تھا۔ اور نہ ایسا ہی ہے کہ اس سے آگے ہم سب نہیں رہیں گے...... اے کنتی پتر یہ آتما نہ مارتی ہے اور نہ ماری جاتی ہے۔ اس آتما کو شستر کاٹ نہیں سکتے۔ آگ جلا نہیں سکتی۔ تتھا اس کو جل گیلا نہیں کرسکتا اور وایو سکھا نہیں سکتی......''

بھائی صاحب کی لڑکی ہر روز گیتا کا پاٹھ کرتی ہے۔ ہر روز گیتا کا پاٹھ ہوتا ہے۔ اور میری چھٹیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میں واپس جانے کے لیے تیار ہوں۔ شام کا وقت ہے۔ اچانک ماں کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ گھر کے سب لوگ اس کی چارپائی کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میری بڑی بہن آنکھوں میں آنسو بھر لیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

''اسے زمین پر اتار لیجئے نا ــــــ دان پن کروالیجئے ــــــ''

اور ہم آہستہ سے ماں کو بچھونے سمیت زمین پر لٹا دیتے ہیں۔ ماں کی آنکھیں نیم وا ہیں۔ سانس اکھڑ رہی ہے۔ میری بہن چمچہ سے ماں کے منہ میں گنگا جل ڈال رہی ہے۔ بھائی صاحب کی لڑکی گیتا کا پاٹھ کر رہی ہے۔ ایک گھنٹہ گزر جاتا ہے۔ ماں کی حالت اب بھی ویسے ہی ہے۔ گلی کے لوگ بھی اکٹھے ہوگئے ہیں ــــــ دو گھنٹے بیت جاتے ہیں۔ لوگ ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں۔ تین گھنٹے بیت جاتے ہیں۔ اور ماں کا سانس پھر ٹھیک چلنے لگتا ہے۔ ماں آنکھیں کھول دیتی ہے۔ ہم سب ماں کی طرف دیکھ

رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہم خوش ہیں۔ ماں ہمیں چھوڑ کر نہیں گئیں! ہم متفکر ہیں۔ ماں اس طرح کب تک لٹکی رہے گی!؟

میں نے دفتر میں تار دیکر پندرہ دن کی چھٹی بڑھالی ہے۔ لیکن ماں کی حالت دن بدن ٹھیک ہوتی جارہی ہے۔ چھٹی ختم ہونے پر میں واپس آجاتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے میری چھٹی ضائع ہوگئی۔

دفتر میں حاضری کے دو ہی دن بعد مجھے تار ملتا ہے۔ ماں کی حالت خراب ہے جلد پہنچو ــــــ اور میں ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر دوبارہ پہنچ جاتا ہوں۔ بچوں کے اسکول جانے کی وجہ سے بیوی بچوں کو چھوڑ آیا ہوں اور ضرورت پڑنے پر بیوی کو فوراً پہنچ جانے کے لیے کہہ آیا ہوں۔

ایک ہفتہ ختم ہونے کے بعد میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی اور بڑھالی ہے۔ لیکن ماں کی حالت ویسے ہی ہے۔ اور اب ہم سب تھک سے گئے ہیں۔ لیکن اس تھکاوٹ کا اظہار کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں کرتا۔ مقررہ وقت سے پہلے موت کیسے آسکتی ہے؟! مجھے ماں کو پھر اسی حالت میں چھوڑ کر جانا پڑے گا کیا۔! اگر اس کی موت کے وقت میں نہ پہنچ سکا تو یہ سب کیا دھرا بیکار ہو جائے گا۔ ساری عمر کے لیے ایک بات رہ جائے گی! ماں تم یہی چاہتی ہو کیا۔؟

ماں کے بستر پر سفید چادر بچھی ہے۔ ہلکا ہلکا پنکھا چلتا رہتا ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مکھی ماں کے چہرے پر، سر پر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور ہم میں سے کوئی پاس بیٹھا اسے ہاتھ سے اڑا دیتا ہے۔ چادر سے ڈھکا ماں کا جسم یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خاص ترتیب سے رکھی لکڑیوں پر چادر ڈال دی گئی ہو!

ماں مر جائے گی تو لاش گاڑی منگوانا پڑے گی، شمشان گھاٹ تک جانے کے لیے۔ کارڈ چھپوانے پڑیں گے، کریا کرم کے لیے لوگوں کو مطلع کرنے کے لیے۔ کریا کرم

پر آنے والے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ ''بڑا مرنا'' کرنا ہے نا۔ باہر سے آئے رشتہ داروں عزیزوں کی رہائش اور کھانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ برہمنوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ پھر خاندان کی بیٹیوں کو کچھ نہ کچھ دینا ہوگا۔ بہنوں کو بھی دینا ہوگا ـــــ ماں کے پھول، ہردوار لے جانے ہوں گے ـــــ موت بھی کتنی مہنگی ہے!

رات کے دس بج رہے ہیں ـــــ میں اندر لیٹا جانے کس وقت سو جاتا ہوں۔ اچانک شور سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ ماں!۔ ماں چلی گئی تو ـــــ! میں باہر دوڑتا ہوں۔ بھائی صاحب، بھابی، بہنیں سب ماں کے اوپر جھکے ہوئے ہیں۔ گھٹی گھٹی سسکیاں ـــــ نم آلود آنکھیں!

ماں کو جلا کر ہم گھر واپس آ گئے ہیں۔ اس وقت سب جان پہچان والے جا چکے ہیں۔ جہاں ماں کی چارپائی پڑی رہتی تھی وہ جگہ اب خالی ہوگئی ہے چارپائی سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی ہے۔ ہم سب دری پر بیٹھے ہیں سب ایک ہی بات سوچ رہے ہیں۔ ماں کو اب ہم کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ کبھی نہیں! دفعتاً بھائی صاحب آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور مجھے اشارے سے اندر کمرے میں چلنے کے لیے کہتے ہیں۔ اندر کمرے میں بھائی صاحب ماں کا ٹرنک کھولتے ہیں۔ بھابی اور بہنیں بھی پاس آ کھڑی ہوئی ہیں۔ ہم سب کی آنکھیں بڑے غور سے ٹرنک کے اندر جھانک رہی ہیں۔ یہ ماں کے وہ کپڑے ہیں جو ماں بیمار ہو جانے سے پہلے اکثر پہنا کرتی تھی۔ بھائی صاحب کپڑے نکال کر پاس پڑی چارپائی پر رکھتے جاتے ہیں۔ یہ ماں کی ساڑی ہے۔ زری کی پرانے فیشن کی بہت ہی پرانی ساڑی! ماں اکثر شادی بیاہ میں یہی زری کی ساڑی پہنا کرتی تھی۔

''ماں کے یہ کپڑے ضائع تھوڑی جائیں گے۔ انہیں پھینکنا تھوڑی ہے۔''

ہم سب کی نگاہیں بڑی بہن کی طرف اٹھ جاتی ہیں ـــــ بھائی صاحب بھی چند

لمحوں کے لیے رک جاتے ہیں۔

''اتنی لمبی عمر بھوگے ہوئے شریر کا کپڑا پہنانے سے بچے کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ ماں کے یہ کپڑے خاندان کے بچوں کے لیے بہت شبھ ثابت ہوں گے! ہاں۔''

ہم سب ان کپڑوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ بھائی صاحب باقی کپڑے ذرا آہستہ آہستہ سنبھال کر نکال رہے ہیں۔ یہ پوٹلی کیسی ہے؟! اس پوٹلی میں کیا ہے۔؟! بھائی صاحب پوٹلی کھولتے ہیں۔ لال رنگ کی، ہاتھی دانت کی پندرہ بیس پرانی چوڑیاں ہیں۔ رنگ بہت ہی ہلکا ہو چکا ہے۔ کچھ تو ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی ماں کو یہ چوڑیاں پہنے نہیں دیکھا۔ ہم سب کی نگاہیں ایک دوسرے کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ لیکن کوئی بھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہا ہے۔ سب کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ کسی پچھلے زمانے کی طرف! بھائی صاحب پوٹلی باندھ دیتے ہیں۔ اور اسے وہیں ٹرنک کے کونے میں رکھ دیتے ہیں۔ وہ اب ٹرنک میں سے آخری کپڑا نکال رہے ہیں۔ یہ میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی کیا چیز ہے؟! بھائی صاحب جلدی جلدی کپڑے کی تہیں کھولتے ہیں۔ کنگن، سونے کے کنگن! دو نہیں تین نہیں۔ چار؟! یہ کنگن ہم سب نے ماں کے ہاتھوں میں دیکھے تھے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ کنگن ابھی تک ماں کے پاس محفوظ ہیں؟۔ میلے اور کم چمکیلے ہونے کے باوجود یہ کنگن ہم سب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتے ہیں! ہم سب جانتے ہیں کہ پرانے فیشن کے یہ کنگن ٹھوس ہیں۔ بہت وزنی ہیں۔ لیکن پھر بھی بھائی ہاتھوں کی مدد سے ان کے وزن کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم سب آنکھوں کی مدد سے۔ باہر بھائی صاحب کی لڑکی گیتا کا پاٹھ کر رہی ہے۔

''......ارجن کے پوچھنے پر شری کرشن مہاراج بولے ......'' کیا بولے ــــــــ؟

ہمیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔

گھسیٹن

ماں باپ نے اس کا نام گھسیٹن رکھا تھا۔ لیکن لوگ اسے چندرا کے نام سے جانتے تھے۔ اس کا اصل نام اب اس کے قریبی رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا۔ چندرا کا خوب صورت نام اسے ''صاحب'' نے دیا تھا۔ صاحب جن کے ہاں وہ چار سال سے اپنی ماں کے ساتھ کام پر جایا کرتی تھی۔ اس کی ماں تو اس سے بھی پہلے سے صاحب کے ہاں برتن مانجھنے اور جھاڑو دینے کا کام کرتی تھی۔ اور اس وقت چندرا کا کام صرف کھیلنا تھا۔ دن بھر گھر سے باہر اپنی ہمجولی لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ گیند، کنچے اور گڈا گڑیا کھیلنا۔ درختوں پر چڑھنا اور کچے پکے امرود، شہتوت، امبیاں توڑنا اور کھانا ـــــــ اس کی ماں کو نہ جانے اچانک اس کا کھیلنا کودنا کیوں کھٹکنے لگا۔ ایک دن اسے ڈانٹتے ہوئے بولی ـــــــ ''گھسیٹن! ہوش کی دوا کر چھوکری۔ اب تو سیانی ہوگئی ہے۔ کودنا پھاندنا بند کر کچھ پتہ بھی ہے تجھے ـــــــ پورے دس سال کی ہونے کو آئی ہے تو ـــــــ لیکن ابھی تک لڑکوں کی طرح دن بھر کودتی پھرتی ہے۔ اُنہہ ـــــــ '' ماں نے پھپھوندی لگے دانت باہر نکال دیئے۔ اور پھر ہتھیلی میں رکھے ہوئے سوکھے تمباکو کو انگوٹھے سے مسلا۔ اور منہ میں رکھ لیا۔ جیسے تمباکو کی اس پھانک نے اسے کچھ اور بھی سُجھا دیا ہو، پھر دانت نکالتے ہوئے بولی ـــــــ ''چل کل سے میرے ساتھ کام پر چل ـــــــ کچھ گھر کا کام کاج بھی

سیکھ لے ـــــ'' اور وہ دوسرے دن سے ماں کے ساتھ صاحب کے ہاں جانے لگی۔

جب پہلے دن وہ صاحب کے ہاں گئی۔ تو اسے بہت عجیب سا معلوم ہوا ـــــ صاحب پولیس میں افسر تھے ـــــ زندہ دل اور بہت ہنس مکھ!

''اری اماں! یہ چھوکری کہاں چھپا رکھی تھی تم نے ـــــ؟ یہ تمہاری ہی لڑکی ہے کیا؟

''جی صاحب۔ بہت نکمی لڑکی ہے۔'' ماں نے اس کی طرف دیکھ کر منہ چڑا دیا۔

''لیکن دیکھنے میں تو بہت گڑیا سی لگتی ہے ـــــ کیا نام ہے تمہارا ـــــ؟'' اور وہ سہم گئی ـــــ

''اری گھسیٹن بولتی کیوں نہیں ـــــ'' اس کی ماں نے سے گھورا۔

''اوہو ـــــ گھسیٹن!؟ ـــــ اس کا نام گھسیٹن ہے؟ ـــــ گھسیٹن؟! ـــــ ہاہا ـــــ ہاہا ـــــ کیا عجیب نام ہے بھئی ـــــ گھسیٹن ـــــ ہاہا ـــــ ہاہا ـــــ'' صاحب ہنستے جارہے تھے اور اس کا نام دہراتے جارہے تھے۔

''بھئی ہم تو گھسیٹن کے نام سے اسے نہیں بلائیں گے ـــــ گھسیٹن! ـــــ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے ـــــ ہم تو اسے کوئی اچھا سا نام دیں گے ـــــ جیسے پدما ـــــ رما ـــــ چندرا ـــــ بس ٹھیک ہے۔ اس کا نام چندرا ہوگا۔ آج سے اس کا نام چندرا ہوگا ـــــ تم بھی سن لو ڈارلنگ ـــــ اس لڑکی کا نام چندرا ہے آج سے ـــــ'' اور میم صاحب بھی ہنس دیں۔ اور اس دن سے وہ ''چندرا'' بن گئی ـــــ گھسیٹن سے چندرا! ـــــ وہ بہت خوش تھی اس دن ـــــ جیسے اسے صاحب نے چندرا کا نام نہ دیا ہو۔ کوئی بہت ہی قیمتی چیز دے دی ہو! گھر والوں نے اس نام کو وقتی نام سمجھ کر ہنسی میں اڑا دینا چاہا۔ لیکن اس کا یہی نام ہوگیا ـــــ اور اب گھر والے بھی اسے چندرا کے نام سے پکارنے لگے ـــــ اور اب تو چار سال ہوگئے ہیں۔ اُس کے اِس نام کو ـــــ!

''اف! چندرا کی بچی، تمہارا نام تو گھسیٹن ہی اچھا تھا ـــــ کم بخت اتنا آہستہ کام

کرتی ہے۔ جیسے کسی بہت بھاری چیز کو گھسیٹ رہی ہو ــــ انہیں بھی نہ جانے اس چڑیل کا یہ نام رکھنے کا کیا شوق چرایا تھا؟ اُنہہ ــــ '' میم صاحب نے منہ چڑاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اور وہ جلد جلد کمرے کے فرش کو گیلے کپڑے سے پونچھنے لگی ــــ 'میم صاحب کو اسے صاحب کا دیا ہوا یہ نام نہ جانے کیوں کھٹکتا ہے! نام ہی تو دیا تھا۔ کوئی جیب میں سے نکال کر روپے تو نہیں دے دیئے تھے'۔ وہ سوچنے لگتی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اپنے نام کو زیر لب گنگنا کر ایک عجیب لذّت محسوس کرتی ــــ یہ نام واقعی بہت قیمتی تھا ــــ! اگر صاحب نے اس ''نام'' کے بجائے اسے جیب سے نکال کر روپے دیئے ہوتے تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ کبھی نہ ہوتی ــــ اور جو ہوتی بھی تو ایک وقتی خوشی ہوتی ــــ روپے کے ساتھ ہی ختم ہو جانے والی ــــ واقعی صاحب نے اسے بہت ہی قیمتی چیز دی تھی! ــــ لیکن اس میں میم صاحب کا نہ جانے کیا بگڑ رہا ہے۔ جو میرے اس نام کو کوسنے لگتی ہیں ــــ کام میں سستی کی سزا مجھے دے دیں میرے نام کو کیوں کوستی ہیں ــــ؟ اور وہ محض اس ڈر سے کہ کہیں وہ اس کے نام کو نہ کوسنے لگیں۔ جلد جلد کام کرنے لگتی ــــ ویسے یہ اس نے اب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ میم صاحب اس دن اس کے نام کو کوستی ہیں۔ جس دن ان کی صاحب کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ سی ہو جاتی ہے۔ اس کی ماں اب تقریباً سارا کام اس کے سپرد کر کے خود دوسرے گھر کام کرنے چلی جاتی تھی ــــ اس نے ایک اور گھر کا کام اٹھا لیا تھا ــــ لیکن میم صاحب ہمیشہ اس کی ماں سے یہی کہتی رہتیں۔

''بھئی چندرا کی ماں! چندرا سے تو کام ٹھیک طرح ہو نہیں پاتا ــــ تمہیں کو یہاں کا کام کرنا چاہئے ــــ یہ لڑکی بہت نکمی ہے ــــ''

اور اسے خواہ مخواہ ڈانٹ سننا پڑتی۔ ''نہ جانے میم صاحب کو مجھ سے چڑ کیوں ہے۔؟ وہ اکثر سوچا کرتی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

''دیکھو چندرا ــــ آج شام کو جھیل کے کنارے چلیں گے۔ آج صاحب کا ہاف ڈے ہے۔ شام کو سب کام ذرا جلدی ختم کر ڈالنا سمجھی!'' ــــ اور وہ جھیل کے کنارے سیر پر جانے کے شوق میں اس دن بہت جلد کام ختم کر لیتی۔ اسے صاحب اور میم صاحب کے ساتھ گھومنے جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ میم صاحب بہت اچھی ساڑی پہنتیں۔ بالوں کو بہت اچھے فیشن سے باندھتیں۔ ان کے کپڑوں سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہوتیں۔ اور اس کا دل چاہتا۔ کہ وہ ان کے ساتھ بالکل ساتھ لگ کر چلے۔ لیکن اسے تو بابا کی گاڑی دھکیلنا ہوتی تھی۔ روتے بسورتے بابا کو چپ کرانے کے لیے تیز تیز گاڑی چلانی ہوتی تھی۔ یا میم صاحب کے حکم سے ان دونوں سے کچھ فاصلہ پر آگے آگے چلنا ہوتا تھا۔ پھر بھی اس کے کان ان کی باتوں کی طرف لگے رہتے۔ ان کی باتیں بھی تو بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ ان کا صحیح مطلب تو وہ نہ سمجھ پاتی۔ لیکن پھر بھی اسے اچھی لگتی تھیں وہ باتیں ــــ

''پدما ڈارلنگ! میں تو تمہارے بغیر بالکل نہیں رہ سکتا ــــ میں تمہیں بیوی کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح پیار کرتا ہوں پدما ــــ'' اور وہ میم صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ــــ

''غضب کرتے ہیں آپ بھی ــــ آہستہ بولئے چندرا ساتھ چل رہی ہے ــــ'' میم صاحب ہاتھ چھڑاتیں ــــ سنسان سڑک پر اندھیرا اور بھی ڈراؤنا ہو جاتا۔

''اوہو ــــ ارے یہ تو ابھی بچّی ہے ــــ ان سب باتوں کو نہیں سمجھ سکتی ــــ'' صاحب ہنس دیتے اور چندرا میم صاحب کے ڈر سے گاڑی کو دھکیلتے ہوئے جلد جلد آگے نکل جاتی ــــ لیکن پھر نہ جانے وہ کیسے ان کے ساتھ آملتی اور اس کے کان ان کی باتوں کی طرف اٹھ جاتے ــــ لیکن وہ یہ اب تک نہ سمجھ پائی

تھی۔ کہ یہ باتیں ایسی بھی کیا ہیں۔ کہ جو مجھے نہیں سننے دینا چاہتی میم صاحب ــــــ صاحب میم کے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن میم صاحب شاید نخرا کرنا چاہتی ہیں۔ میم صاحب سے صاحب کہیں زیادہ اچھے ہیں۔ اس نے سوچا۔ کتنے اچھے اچھے کپڑے، اچھی اچھی چیزیں لاکر میم صاحب کو دیتے ہیں ــــــ اور اس کے لیے بھی تو ایک دھوتی لائے تھے ــــــ لیکن میم صاحب کو تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔

''بھئی ڈارلنگ تم تو خواہ مخواہ شک کرتی ہو۔ اپنی نوکرانی اگر اچھے کپڑوں میں رہے گی۔ تو اس میں برا کیا ہے آخر؟ ــــــ تم نہ جانے کیا سمجھتی ہو ــــــ''؟ اور وہ غصہ سے دوسرے کمرے میں چلے گئے ــــــ چندرا کچھ نہ سمجھ سکی۔ اسے تو اس وقت یہ افسوس ہو رہا تھا۔ کہ میم صاحب نے وہ دھوتی اسے نہیں دی۔

''یہ دھوتی اچھی نہیں ہے چندرا ــــــ میں تمہیں دوسری دھوتی لا دوں گی ــــــ''

اور انہوں نے وہ دھوتی ٹرنک میں بند کر دی۔ اور چندرا دل مسوس کر رہ گئی۔

''یہ دیکھو پدما ڈارلنگ ــــــ تمہارے لیے کیا لایا ہوں ــــــ''

''کیا ہے ــــــ دیکھوں ــــــ؟''

''یہ دیکھو ــــــ!''

''او بیوٹی فل! ــــــ ہاؤ سویٹ! کتنی خوبصورت رسٹ واچ ہے ــــــ! آپ کتنے اچھے ہیں ــــــ! لائیے دیکھوں ــــــ!!''

''واہ! بس یونہی مفت میں لینا چاہتی ہو ــــــ؟'' صاحب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ــــــ اور میم صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا ــــــ اور پھر انہوں نے انگوٹھا دکھاتے ہوئے صاحب کا منہ چڑا دیا ــــــ اور صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے ــــــ

انہوں نے میم صاحب کے منھ چڑانے کا کچھ بھی برا نہ مانا ——!

''اچھا۔ لاؤ باندھ دوں —— ''صاحب کی فراخدلی ——

''نہیں ہم نہیں بندھواتے —— ''میم صاحب کا نخرہ ——

اور یہ دیکھ کر چندرا کو میم صاحب پر بڑا غصہ آیا —— صاحب نے مسکراتے ہوئے وہ گھڑی میم صاحب کی کلائی پر باندھ دی —— اور چندرا کی نگاہیں جیسے گنگنا اٹھی ہوں —— کتنے اچھے ہیں صاحب!

''پدما یہ دیکھو، یہ ایلو گارڈنر کا پوز کتنا گرینڈ ہے —— '' صاحب پلنگ پر بیٹھے تھے۔ اور پاس ہی میم صاحب بیٹھی تھیں۔ چندرا دروازے کے پاس بابا کو لیے کھلا رہی تھی —— لیکن اس کے کان اندر کی باتیں سن رہے تھے۔

''آپ کو تو ایسی ننگی تصویریں اچھی لگتی ہیں —— ''

''ارے نہیں بھئی، تم سب سے اچھی لگتی ہو —— ہاہا —— ہاہا —— ''اور اسی وقت بابا اندر دوڑا اور چندرا اس کے پیچھے پیچھے دوڑی —— اس نے دیکھا میم صاحب کا ہاتھ صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ اور صاحب اسے پیار سے دیکھ رہے ہیں —— ''وہ ٹھٹھک گئی ——

میم صاحب نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور صاحب کی طرف بناوٹی غصہ سے دیکھنے لگیں۔ اور پھر صاحب کے لیے ان کی مصنوعی ناراضگی چندرا کے لیے اصل غصہ میں بدل گئی۔

''چندرا —— ابھی تک تم بابا کو گھمانے کے لیے نہیں لے گئی ——!'' اور وہ اسی وقت باہر نکل آئی —— میم صاحب اس وقت اس کا اندر آنا پسند نہیں کر رہی تھیں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر تو اندر گئی نہ تھی ——! ہاں، اب اسے بھی یہ سب باتیں کچھ عجیب سی

معلوم ہونے لگی تھیں ــــــ جنہیں دیکھ کر وہ سہم سی جاتی تھی۔ لیکن جب نہ دیکھ سکتی۔ تو دیکھنے کے لیے بے چین سی ہو جاتی ــــــ

''صاحب اور میم صاحب میاں بیوی جو ہوئے ــــــ'' اس کا دماغ اسے سمجھاتا ــــــ اور یہ سوچ کر اس کی بے چینی ایک قسم کی راحت میں بدل جاتی ــــــ!

''میم صاحب! آج چندرا کو ذرا جلدی چھٹی دے دیجئے گا ــــــ آج اسے کچھ عورتیں دیکھنے کے لیے آرہی ہیں۔'' اس کی ماں نے ایک دن میم صاحب سے آکر کہا۔ اور وہ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی ــــــ گھر میں دو چار دن سے اس کی منگنی کی بات چل رہی تھی۔ اور وہ خوش تھی۔ یہ سن کر ــــــ اس کی منگنی ہوگی اور پھر اس کی شادی ہوگی ــــــ شادی تو ایک اچھی چیز ہے ہی ــــــ اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملیں گے ــــــ سفید سفید چاندی کی بالیاں، جھومر، پازیب، چھن چھن۔ جیسے اس کی پڑوسن کی بہو چمبیلی کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہوگی۔ کہ وہ بھی اپنے گھر والی ہو جائے گی۔ اس کا بھی اپنا ایک آدمی ہوگا ــــــ آدمی ــــــ اور وہ سوچ کر کچھ سوچ میں پڑ گئی ــــــ اس کے ساتھ اسے کیسے رہنا ہوگا ــــــ؟ جیسے چمبیلی اپنے آدمی کے ساتھ رہتی ہے۔ جیسے میم صاحب، صاحب کے ساتھ رہتی ہے۔ لیکن میں تو اس کے ساتھ کھیلا بھی کروں گی۔ خوب مزا رہے گا۔ لیکن نہ جانے کیسے سبھاؤ کا ہو۔!

''چندرا تمہاری ماں تمہارے لیے یہ کپڑے رکھ گئی ہے ــــــ باتھ روم میں نہا کر یہ کپڑے پہن لو ــــــ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں لینے آئے گی ــــــ'' اور یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی ــــــ میم صاحب نے اسے اپنے باتھ روم میں نہانے کی اجازت دے دی تھی! آج چار سال سے وہ اس گھر میں کام کر رہی تھی ــــــ صبح ماں کے ساتھ آتی تھی۔ تو نہا دھو کر ہی آتی تھی۔ ماں تھوڑی دیر بعد چلی جاتی۔ اور یہ سارا دن وہیں رہتی۔

بابا کو کھلاتی ــــــ شام کو جب ماں پھر آتی تو یہ اس کے ساتھ ہی چلی جاتی ــــــ اس کا بہت دل چاہتا ۔کہ وہ ایک دن یہیں باتھ روم میں پھوارے کے پانی سے نہائے ــــــ کتنا صاف ستھرا تھا باتھ روم ــــــ چکنا رنگ برنگا فرش ــــــ اور پھر ایک طرف ایک ''شیلف'' پر میم صاحب کی بڑھیا بڑھیا چیزیں، پوڈر کریم، خوشبو دار تیل ۔سفید جھاگ والا خوشبو دار صابن ــــــ دانتوں میں لگانے کی کریم ۔سینٹ کی شیشی جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی پچکاری لگی ہوئی تھی ۔تا کہ پھوار کی طرح جسم پر سینٹ چھڑکا جاسکے پاؤں کے تلوے صاف کرنے کے لیے ربڑ کا برش ــــــ ان سب چیزوں کے استعمال کی چاہ اس کے دل میں کئی بار ابھری تھی ــــــ لیکن اسے اس چاہ کو دبا دینا پڑا تھا۔اور اب تو میم صاحب نے خود ہی اسے باتھ روم میں نہانے کو کہا ہے۔اب وہ ان سب چیزوں کو استعمال کرے گی ــــــ اور وہ خوشی سے بھرا دل لیے باتھ روم میں گھس گئی ــــــ اس نے باری باری سب چیزوں کا استعمال کیا۔اس نے اپنے جسم پر اچھی طرح پوڈر چھڑکا ۔اور پھر جب نئے کپڑے پہن کر باہر نکلی ۔تو صاحب اور میم صاحب ساتھ ہی کے کمرے میں کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مل گئے ۔چندرا گھبرا گئی۔کہ کہیں اس کی چوری نہ پکڑی جائے۔وہ چپکے سے کھسکنے کے سے انداز میں دوسرے کمرے کی طرف بابا کے پاس جانے لگی۔تو اس نے صاحب کو میم صاحب سے کہتے سنا۔

''تُم دیکھ لینا۔یہ لڑکی بڑی ہو کر بہت خوب صورت نکلے گی ــــــ ونڈرفل نکلے گی ــــــ کیسے گرینڈ فیچرز ہیں اس کے ــــــ''

''اور آپ کی نظریں اسے جوان بھی جلد کر دیں گی ــــــ!'' میم صاحب کے لہجہ میں غصہ تھا۔اس کے آگے وہ کچھ نہ سن سکی۔اور بابا کو بہلانے میں لگ گئی۔

اپنے گھر میں اپنی جان پہچان کی لڑکیوں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اری گھسیٹن! آج تو بہت خوشبو دار ہو رہی ہے'' ــــــ اور وہ جل ہی تو گئی

گھسیٹن کے نام سے ____

''نہ بھئی۔ ہمیں۔ یہ مذاق اچھا نہیں لگتا ____ مجھے میرے نام سے بلایا کرو۔''
''اری ہاں ری چھمی، اب اس کا نام چندرا ہے۔ پارو نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔
''اچھا ____!'' چھمی بچاری بہت عرصہ کے بعد وہاں آئی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ اب اسے گھسیٹن کے نام سے کوئی نہیں بلاتا ____ چھمی اسی محلے میں رہتی تھی۔ جہاں اس کی شادی طے ہو رہی ہے ____ اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ چھمی گھسیٹن کہہ کر اسے بلائے۔ اسے بھی تو اس محلے میں جانا تھا ____ وہاں بھی تو وہ چندرا ہی ہوگی۔
''کیوں نہیں اب تو تُو سچ مچ کی چندرا بنے گی میری رانی ____ لیکن سنا ہے۔ کہ وہ چھیدی بالکل گنوار سا ہے ____'' پارو نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا ____ اور وہ وہاں سے اٹھ آئی ____ اس کے ہونیوالے شوہر کا نام چھیدی تھا۔ یہ وہ اپنے گھر میں سن چکی تھی ____ اسے یہ نام بہت برا معلوم ہوا ____ رمیش بابو، پرکاش صاحب، ورما جی ____ کتنے اچھے اچھے نام ہیں صاحب کے دوستوں کے ____ وہ بھی اپنا نام کیوں نہیں بدل لیتا۔ کسی صاحب کے ہاں نوکری کرتا تو بدل ہی جاتا نام اس کا ____ لیکن وہ تو حلوائی کی دکان پر کام کرتا ہے ____ اُنہہ ____! حلوائی کی دکان پر نوکری کا بھلا صاحب کے ہاں کی نوکری سے کیا مقابلہ ____؟ لیکن اب تو اسے بھی یہ نوکری چھوڑ دینی ہے ____ اب تو وہ اس گھر سے کچھ ہی دنوں بعد چلی جائے گی ____ اور اس کی آنکھیں بھر آئیں ____ ایک دن جانا تو ہوتا ہی ____'' اس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا ____ اور کچھ دیر بعد وہ عورتیں اسے دیکھنے آئیں اور وہ پسند کر لی گئی ____ اس کی منگنی ہوگئی۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں شادی بھی ہوگئی۔

اسے سسرال آئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔اور یہ پندرہ دن اس نے کس مصیبت میں کاٹے تھے، وہی جانتی تھی ـــــ اس نے شادی کی جو تصویر اپنے دماغ میں بنا رکھی تھی وہ یہاں اسے کہیں نظر نہ آئی ـــــ اس نے تو سوچ رکھا تھا۔ کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ صرف اچھی اچھی باتیں ہی نہیں کرے گی۔ کھیلا بھی کرے گی۔ اور سسرال آکر اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ساس نے اس کے مرد کے ساتھ زیادہ ملنے جلنے ہی نہ دیا تھا۔ انہیں کبھی بھی اکیلے نہیں چھوڑا ـــــ اور وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ یہ سب کچھ تو وہ برداشت کر بھی لیتی ،لیکن سب سے بڑا ظلم جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اور جس نے اسے بہت ہی دکھ پہنچایا تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ اس گھر میں کوئی بھی اسے چندرا کے نام سے نہ بلاتا تھا۔!

''گھسیٹن بی بی۔ گھسیٹن بی بی ـــــ جدھر دیکھو گھسیٹن بی بی ـــــ!! بی بی کا ایک لفظ زیادہ کر دیا گیا ہے۔تو کون سی بڑی بات ہوگئی ہے ـــــ'' اس بی بی کے ساتھ لگانے سے وہ کمی کہاں پوری ہو سکتی تھی۔ جو اس نے چندرا جیسے خوبصورت نام کے ختم ہو جانے سے محسوس کی تھی ـــــ اور وہ جتنے دن سسرال میں رہی۔ یہ سوچ کر جلتی بھنتی رہی۔ روتی رہی، آہیں بھرتی رہی۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ وہ اپنا دکھ بھی کسی کو نہ بتا سکتی تھی۔ سب یہی سمجھتے تھے۔ کہ بہو کو گھر کی بہت یاد آرہی ہے۔ان لوگوں کی ناسمجھی پر اسے اور غصہ آتا۔ اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اور جب پندرہ دنوں کے بعد اس کا بھائی اسے لینے آیا۔ تو وہ اتنی جلدی تیاری ہوگئی۔ کہ سب حیران رہ گئے۔ اس نے وہاں سے چلتے وقت غصہ میں اپنی ساس کے پاؤں بھی نہ چھوئے، کسی سے ملی بھی نہیں ـــــ اور اس بات کو اس کے بھائی نے بھی محسوس کیا ـــــ وہ گھر آتے ہی ماں کے گلے مل کر خوب روئی ـــــ روتی جاتی تھی۔ اور کہتی جاتی تھی ـــــ ''اماں میں اب وہاں کبھی نہ جاؤں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ چاہے تم مجھے مار ڈالو ـــــ لیکن مجھے وہاں نہ بھیجنا

اماں ــــ وہاں نہ جانے دینا مجھے ــــ '' یہ دیکھ کر اس کی ماں، اس کا بوڑھا باپ اور اس کے سب گھر والے سوچ میں پڑ گئے ــــ!

''اری چندرا کب آئی ہو سسرال سے ــــ اری تم تو بہت دُبلی ہوگئی ہو ــــ!''

اس دن شام کو وہ اپنی ماں کے ساتھ میم صاحب سے ملنے آئی تھی ــــ اور صاحب بنگلے کے دروازے پر ہی مل گئے تھے۔

''جی بس آج صبح ہی تو آئی ہوں ــــ'' وہ شرما سی گئی اور جلدی سے بنگلے کے اندر چلی گئی۔ اس کا چندرا نام اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا ــــ آج کتنے دنوں بعد اسے پھر چندرا نام سے پکارا گیا تھا ــــ اور وہ بھی صاحب نے اسے پکارا تھا ــــ صاحب کے لیے اب بھی وہ چندرا ہی تھی۔

اندر میم صاحب نے بھی اسے چندرا نام سے بلایا ــــ بابا نے بھی چندرا ہی نام سے پکارا ــــ اور اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی کھوئی ہوئی کوئی بہت ہی قیمتی چیز اسے پھر مل گئی ہو ــــ!

''اری چندرا! تمہارا آدمی کیسا ہے؟'' جب اس کی ماں چلی گئی۔ تو میم صاحب نے پوچھا ــــ ان کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا۔ جیسے وہ اس سے کوئی راز کی بات پوچھ رہی ہوں۔

''میں کیا جانوں میم صاحب ــــ'' اس کی آواز میں ایک تلخی سی گھلی ہوئی تھی۔ وہ میم صاحب کے اس طرح پوچھنے سے شرمائی نہیں۔ اور یہ دیکھ کر میم صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیوں؟'' انہوں نے اسے گھورا۔

چندرا کی آنکھوں میں رنج وغصہ کے آنسو چھلک آئے ــــ ''اماں نے پتہ نہیں کیوں اس جگہ میرا بیاہ کر دیا ہے ــــ؟''

آواز اس کے گلے میں اٹکی ہوئی سی معلوم ہوئی ــــ اور میم صاحب شک اور

حیرت کی ملی جلی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔ انہوں نے چندرا سے اس کی سہاگ رات کی بات سن کر مزا لینے کی سوچی تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا____! ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چندرا کی باتیں ایک پہیلی سی ہوں۔ اور وہ اس پہیلی کو بوجھ نہ پا رہی ہوں____! پھر تھوڑی دیر بعد ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ اور وہ گہری نظروں سے چندرا کی طرف دیکھنے لگیں____ لیکن چندرا ان کی تیز نگاہوں کا مطلب نہ سمجھ سکی____ اور اٹھ کر بابا کی طرف چلی گئی____

شام کو میم صاحب نے جب اس کی ماں سے کچھ کہا۔ تو اس نے ماں کو دھیرے سے کہتے سنا۔

''میم صاحب! سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں نے پتہ کر لیا ہے____ بس اس کی ساس کا خیال ہے کہ یہ ابھی چھوٹی عمر کی ہے۔ اس لیے ابھی کچھ دنوں تک دونوں کو الگ رکھنا چاہتی ہے۔ گونا بھی تو جلدی کر دیا تھا نا____'' اور یہ کہتے کہتے اس کی بوڑھی ماں یوں مسکرا دی۔ جیسے یوں کہنے سے اسے شرم سی لگ رہی ہو____ اور چندرا کے دل میں ماں کے لیے غصہ بھڑک اٹھا____ ''یہ میری ماں اب باتیں بنا رہی ہے۔ لیکن میں کبھی وہاں نہیں جاؤں گی____ کبھی نہیں جاؤں گی____'' اس نے دل میں ٹھان لی۔

لیکن اسی شام، تھوڑی دیر کے بعد میم صاحب کو جو اپنی ایک سہیلی سے جو ان سے ملنے آئی تھی یہ کہتے سنا۔

''تم نہیں سمجھتی شیلا! اس نے شادی سے پہلے نہ جانے کیا کیا سپنے دیکھے ہوں گے____ جو اسے پورے ہوتے دکھائی نہیں دیئے۔ اور پھر مردوں کا تو اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا____ میں اس کی ماں سے کہہ کر کل ہی سے اس کا یہاں آنا بند کر دوں گی اور ہمیشہ کے لیے____'' اور یہ سن کر چندرا کے پاؤں تلے زمین نکل گئی____ ''میم صاحب میرا یہاں آنا بند کر دیں گی____! کیوں____؟ آخر کیوں؟''____ اس

نے بہت سوچا۔ لیکن میم صاحب کی باتوں کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔۔۔۔ ''تو وہ اب کبھی بھی یہاں نہ آسکے گی۔ پھر اسے کوئی بھی چندرا نہ کہے گا۔۔۔۔؟ اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''دوسرے دن صبح سویرے ابھی اس کی ماں چارپائی سے بھی نہ اٹھی تھی۔ کہ وہ اس کے پاس گئی۔۔۔۔ ''اماں میں نے سوچا ہے کہ جب وہ کل لینے آئیں گے۔ تو میں چلی جاؤں گی۔۔۔۔ میری ساس کہیں ناراض نہ ہو جائے نا۔۔۔۔ ''اور اس کی ماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔۔۔۔ وہ کیا جانے کہ گھسیٹن ....؟!''

کام کے لوگ

بازار میں چورا ہے کے پاس بھیڑ جمع ہے ___ فٹ پاتھ پر ایک گٹھری پڑی ہے ___ پیدل چلنے والے، سائیکل سوار، سکوٹر سوار یا کار پر جانے والے پاس آتے ہیں۔ ایک نظر اس گٹھری پر ڈالتے ہیں۔ وہاں کھڑے کسی شخص سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ایک عارضی سا دکھ محسوس کرتے ہیں۔ اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جی ہاں، وہ گٹھری نہیں ہے۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک بھکارن کی لاش ہے! ___ بھکارن اپنے پیروں کو پیٹ کے ساتھ سکیڑے، اپنے بوسیدہ، نیلے رنگ کی گندی چادر کو اپنے ارد گرد کس کر لپیٹے ہوئے مرگئی تھی۔ یعنی اس نے مرنے سے پہلے، یا مرتے وقت، اپنے جسم کو، منہ سر کو خود ہی چادر میں، گٹھری کی شکل میں باندھ لیا تھا۔ اور اب اس گٹھری میں صرف گانٹھ لگانا باقی ہے!

وہ بھکارن پچھلے ایک سال سے اس جگہ بیٹھی دکھائی دیتی تھی چند چیتھڑوں اور المونیم کے ایک پرانے بھدے سے کٹورے کو سامنے رکھے! نہ جانے اس کا نام کیا تھا؟ بھکاریوں کے نام کہیں درج نہیں ہوتے نہ کہیں رجسٹرڈ ہوتے ہیں۔ بھیک مانگنا ایک پیشہ ہے۔ اور اپنا پیشہ اختیار کرنے کا حق ہر کسی کو ہے۔ کچھ پیشے پشت در پشت چلے آتے ہیں اور بھیک مانگنا بھی ایک ایسا ہی پیشہ ہے۔ اس بھکارن کے بارے میں یہ کہنا مشکل

تھا کہ وہ بھیک مانگنا ماں باپ سے وراثت میں لائی تھی یا یہ پیشہ اس نے خود اختیار کیا تھا!

سردیاں آئیں تو اس نے اپنے آپ کو اپنی میلی کچیلی چادر میں لپیٹ لیا اور پھر وہ اسی طرح چادر میں لپٹی پڑی رہتی۔ ایک سوکھا، مرجھایا ہوا سا جسم!ــــ صبح کے وقت دھوپ والی جگہ اور رات کو برآمدے میں کسی دکان کے سامنے!ــــ اور اس طرح سردی سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ــــ راہ گیروں نے پچھلے دنوں اسے کراہتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی یا شاید اس نے مانگنے کا ایک نیا ڈھنگ اپنایا تھا! زیادہ سوچ کر کون اپنا دماغ خراب کرتا؟

آج صبح سویرے، جب بھنگی جھاڑو دینے آیا تو اس نے اسے بجائے برآمدے میں پڑی ہونے کے، باہر سڑک کے کنارے پڑی پایا ــــ اسے حیرت ہوئی ــــ سسری تمام رات باہر سردی ہی میں پڑی رہی۔؟! اس نے جھاڑو مار کر اسے جگانا چاہا اور اس کے نہ ہلنے پر وہ کچھ گھبرا سا گیا اس نے اپنے ساتھیوں کو بلایا اور تب اسے پتہ چلا کہ بھکارن مری پڑی تھی نہ جانے رات کو کس وقت مری تھی؟

پھر آہستہ آہستہ وہاں بھیڑ اکٹھی ہونے لگی۔ زیادہ تر لوگ ایک نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ اور وہاں کھڑے وہی لوگ تھے جس کے پاس فالتو وقت تھا۔ بھیڑ میں کھڑے ایک کھدر پوش جوان کو جوش آیا اور وہ سامنے دکان پر پولیس کو فون کرنے کے لیے گیا۔ دکان میں گاہکوں کی بھیڑ تھی۔ یہ کمبلوں کی دکان تھی۔ گھٹیا سے گھٹیا کمبل اور بڑھیا سے بڑھیا کمبل۔ اور لوگ سردی سے بچنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق کمبل خرید رہے تھے۔ اور دکاندار بہت مصروف تھا۔ کھدر پوش جوان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ سامنے بھکارن کی لاش کے پاس سے آئے ہیں۔ اور اس نے گاہکوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر نہایت انکساری سے ان کی طرف دیکھا۔ جب انہوں نے ٹیلیفون کی طرف اشارہ کیا تو اس نے یوں ٹیلیفون آگے بڑھایا جیسے ٹیلیفون کرنے کی اجازت نہ

دے رہا ہو، کمبل دان میں دے رہا ہو!

ٹیلیفون آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔

''کل شام کو وہ بہت کراہ رہی تھی جی ____ میں نے ہسپتال والوں کو فون کیا تھا ____ پولیس کو بھی فون کیا تھا۔ ہاں۔ پر کوئی بھی بچاری کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوا ____ کتنے دکھ کی بات ہے جی ____ بچاری ساری رات سردی ہی میں پڑی رہی!''

کھدر پوش جوان نے لالہ کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے پولیس کو فون کیا۔

جواب ملا ____ ''پولیس اس میں کیا کر سکتی ہے ____؟! بار بار پولیس کو کھٹکھٹائے جا رہے ہیں آپ ____؟''

نوجوان نے کہا ____ ''آپ فلائنگ سکویڈ کو تو بھیج سکتے ہیں۔ لاش اٹھالے جائیں ____'' جواب ملا ____ ''کہاں اٹھالے جائیں ____ ____ ...... ____ ......؟'' آپ لوگ انتظار کیجیے۔ کوئی نہ کوئی اس کا رشتہ دار ساتھی ضرور آجائے گا۔ اور اسے اٹھالے جائے گا ____ وہ قدرتی موت مری ہے۔ ہم اس بے کار کے جھنجھٹ میں کاہے کو پڑیں ____ اگر آپ چاہیں تو میونسپل کارپوریشن میں فون کر دیں۔'' کارپوریشن والوں کو فون کیا گیا لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا ____

دُکان میں کھڑے ایک آدمی نے بجھاؤ دیا ____

''سول ہسپتال میں فون کیجئے نا ____ وہ لاش اٹھالے جائیں گے۔''

لیکن ہسپتال والوں نے جواب دیا۔ وہ اس لاش کو ٹھکانے تو لگا سکتے ہیں لیکن کچھ قاعدے قانون ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ مجبور ہیں ____

بھیڑ میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن کوئی بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا ____ پولیس مجبور تھی۔ ہسپتال والے مجبور تھے۔ ہر آدمی مجبور تھا ____ ایک سفید ریش بزرگ زمانے کو کوس رہے تھے۔

''کیا زمانہ آگیا ہے ــــ کسی کے دل میں سوشل سروس کی خواہش ہی نہیں ــــ ایک وہ زمانہ تھا کہ کئی لوگ سوشل سروس کے لیے تیار رہتے تھے ایسے معاملے میں لوگ آگے بڑھتے تھے اور اس طرح کے لاوارث مردے کو بھی باقاعدہ عزت کے ساتھ ٹھکانے لگاتے تھے!''

اسی وقت کسی نے سجھاؤ دیا ــــ

''چندہ جمع کیا جائے!''

اور چند آوازوں نے اس سجھاؤ کی تائید کر دی ــــ

''ہاں ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے ــــ یہ ٹھیک ہے ــــ''

اور کچھ لوگوں کے ہاتھ ان کی جیبوں کی طرف بڑھنے لگے ــــ لیکن پھر ایک آواز آئی ــــ

''ارے بھئی، پہلے یہ تو دیکھ لو ــــ یہ ہندو ہے یا مسلمان۔ آخر کس طریقے سے اسے ٹھکانے لگانا ہے ــــ؟'' اور لوگوں کے ہاتھ پھر رک گئے سب کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔ سب کی نگاہیں اس گٹھڑی کی طرف اٹھ گئیں ــــ گٹھڑی میں چہرے کے پاس ایک کافی بڑا سوراخ تھا جس میں سے بھکارن کی ادھ کھلی آنکھیں جھانک رہی تھیں ــــ وہ نیم وا آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں ــــ ایک لاش کا کیا مذہب ہوسکتا ہے! اور پھر بھکارن کی لاش کا ــــ؟ میں تو صرف مٹی ہوں۔ اس مٹی کو کسی طرح بھی مٹی کے ساتھ ملا دیجئے ــــ''

لیکن آنکھوں کی وہ زبان کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی! ــــ اگر کسی کی سمجھ میں آرہی تھی تو اس کے پاس وقت نہیں تھا! ــــ اس مٹی کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھی تو وقت درکار تھا!

دکان کے اندر کھڑے لوگوں کا جوش بڑھ رہا تھا سرکار کو کوسا جارہا تھا۔

''ارے بھئی، ہیلتھ منسٹر کو فون کیجئے نا ـــــ آخر راجدھانی میں تو ان کو فون کیا جا سکتا ہے ـــــ فوراً ہیلتھ منسٹر کا نمبر ملایا گیا ـــــ پتہ چلا وہ دورے پر ہیں ـــــ ان کے پی ۔ اے بول رہے تھے ـــــ ان سے مدعا بیان کیا گیا ـــــ کہنے والا نوجوان بڑے جوش میں تھا ـــــ ادھر سے بھی اسی جوش میں آواز آئی منسٹر کو فون کرنے سے کیا فائدہ ـــــ ؟! پولیس کو فون کیجئے یا کارپوریشن والوں کو فون کیجئے ـــــ'' اور ادھر سے ٹیلیفون رکھ دیا گیا ـــــ بولنے والے جوان نے بھی گالی دیتے ہوئے فون رکھ دیا ـــــ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دکان سے باہر آ گیا ـــــ

اب بھیڑ میں عجیب سی بے چینی پھیل رہی تھی۔ ایک طرف ہندو کھڑے تھے۔ دوسری طرف مسلمان کوئی بھی یہ فتویٰ دینے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ لاش ہندو ہے یا مسلمان ـــــ ؟! آخر اس لاش کا کیا کیا جائے ؟! ـــــ ٹریفک کا سپاہی بھی پریشان تھا ـــــ اور پھر اچانک بھیڑ کو چیرتے ہوئے دو بھکاری آگے بڑھے۔ چیتھڑے پہنے۔ جھکے جھکے لاغر بدن ـــــ

''ہائے چاچی!''

''او میری موسی! ہمیں چھوڑ کر کہاں چلی گئی تُو ـــــ ؟ ہائے!''

وہ دونوں لاش کے ساتھ لپٹ گئے ـــــ اور لوگ ذرا پرے ہٹ گئے ـــــ

''چلو، بچاری کے دو رشتہ دار تو آ ہی گئے! ـــــ اب خود ہی نپٹ لیں گے ـــــ

لوگوں نے اطمینان کی سانس لی ـــــ وہ دونوں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ـــــ بھکارن سہی، آخر رشتہ دار تھی ـــــ بھکاریوں کی رشتہ دار بھکارن ہی تو ہو گی ـــــ ایک عزیز رشتہ دار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا دکھ بھکاریوں کو بھی تو ہوتا ہے!

وہ رو رہے تھے اور لوگوں سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگ رہے تھے۔ اور اب

لوگوں کے ہاتھ جیبوں کے اندر جا رہے تھے ،جیبوں کے باہر آ رہے تھے اور پانچ پیسے، دس پیسے، بیس پیسے چار آنے ،آٹھ آنے ان کی طرف گر رہے تھے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی او پھر آہستہ آہستہ بھیڑ بھی چھٹ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد، ان دونوں میں سے ایک اٹھا اور پاس کھڑے رکشا والے کے پاس گیا ——

''بھیا؟ میڈیکل کالج کے پیچھے ہماری جھونپڑی ہے —— وہاں تک لے چلو!''

رکشا والے نے منہ مانگے دام طے کیے —— اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا ——

دونوں نے لاش کو گٹھڑی میں باندھا اور اپنی گود میں لے کر رکشا میں بیٹھ گئے —— رکشا والا میڈیکل کالج پہنچا تو انہوں نے اسے میڈیکل جالج کے اندر چلنے کے لیے کہا —— رکشا والا کچھ حیران سا انہیں اندر لے آیا —— مردہ خانے کے پاس انہوں نے رکشا روک لیا اور لاش کو ایک جگہ سڑک کے کنارے رکھ دیا —— رکشا والے کو پیسہ دے کر، ایک بھکاری مردہ خانے کے اندر چلا گیا۔ دوسرا لاش کے پاس کھڑا رہا —— رکشا والا وہیں پرے کھڑا تعجب سے انہیں دیکھنے لگا —— تھوڑی دیر کے بعد ،اس بھکاری کے ہمراہ ہسپتال کا ایک کارکن ایک ہاتھ گاڑی لیے آ رہا تھا ——

''کہاں ہے لاش ——؟''

''یہ رہی ——''

''تمہاری رشتہ دار تھی ——''

''جی سرکار ——''

''تو لاش کو خوشی سے بیچ رہے ہو نا۔'' جی سرکار!

''تم لوگ واقعی بڑے کام کے آدمی ہو۔ اگر تمہارے جیسے لوگ اپنے عزیز رشتہ داروں کے مردے نہ بیچ جائیں تو لڑکا لوگ پڑھیں گے کیا ——؟ لاوارث مردے تو

اتنے ملتے نہیں ہیں ــــــ''

اور ان دونوں نے مل کر لاش کو ہاتھ گاڑی پر رکھ دیا ــــــ اور پھر اس آدمی کے ساتھ وہ گاڑی لیے ایک طرف چلے گئے ــــــ تھوڑی دیر بعد وہ میڈیکل کالج سے باہر آئے تو بہت خوش تھے ــــــ گیٹ پر وہی رکشا والا کھڑا تھا ــــــ

''چلو رکشا والے! اسٹیشن کے پاس لے چلو ــــــ''

رکشا والے نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور رکشا میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تم نے لاش بیچ دی ــــــ ؟!''

''ہاں ــــــ کیا برا ہے۔تمہارے رکشا کا کرایہ کاٹ کر، ایک اچھی خاصی رقم بچ گئی ہے! ــــــ ہمارے بھی پیسے بن گئے اور وہ سالی بھی ٹھکانے لگ گئی!''

اور رکشا والا ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی، پیڈل پر زور لگانے لگا۔اس کی حیرت کچھ بڑھ گئی تھی۔

مصنوعی آنکھ

یہ تو میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی مصنوعی آنکھ کی وجہ سے جو اداسی میرے من پر بچپن سے چھائی چلی آ رہی تھی وہ ایک دن یوں اچانک جاتی رہے گی ــــــ اور یہ آج ہی ہوا ہے۔ ابھی ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے۔ دو ماہ ہو چکے ہیں میری شادی کو۔ لیکن مجھے آج تک سچی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اور اب ــــــ اب میں کتنی خوش ہوں ــــــ کتنی خوش۔!

میں ڈیڑھ برس کی تھی جب میری دائیں آنکھ جاتی رہی تھی۔ اس حادثے کی یاد تو بھلا مجھے کیا رہنی تھی لیکن اپنی بدقسمتی کا احساس مجھے میری ممی کی سرد آہوں نے بچپن میں ہی کرا دیا تھا۔ جہاں تک ایک آنکھ سے دکھائی دینے کا سوال ہے تو یہ کمی اس وقت جب میں نے ہوش سنبھالا مجھے بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ اس وقت میں یہی سمجھتی تھی کہ میرے ساتھ کے بچوں کو، منوج کو، رشمی کو، آشا کو بھی اسی طرح نظر آتا ہے۔ ایک طرف روشنی اور ایک طرف اندھیرا ــــــ! لیکن ان سب کو دائیں طرف دیکھنے کے لیے اس قدر سر کو گھمانے کی ضرورت تو نہیں پڑتی ــــــ؟ اس بات پر بھی میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت مجھ میں اتنی صلاحیت ہی کہاں تھی۔ اور پھر میری مصنوعی آنکھ بھی تو اتنی عمدہ تھی کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ میری مصنوعی آنکھ میرے ڈیڈی نے ایک جرمن ڈاکٹر سے بہت

بڑی رقم دے کر لگوائی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرا دیکھنے پر مجھے اپنی دونوں آنکھوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔ دونوں میں گلابی ڈورے تھے۔ سفیدی تھی۔ تھوڑا سا بھورا پن لیے ہوئے سیاہی تھی۔ دونوں موٹی موٹی اور خوبصورت تھیں، اور فرق کو سمجھنے کا مجھ میں شعور نہیں تھی۔ اور پھر جلدی اپنا یہ نقص مجھ پر ظاہر ہوگیا۔ یا یوں کہیئے کہ ظاہر کر دیا گیا۔ اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میری آدھی دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔ میری شوخیاں میری شرارتیں ختم ہوگئیں اور میں اچانک ایک سنجیدہ، خاموش طبع لڑکی میں بدل گئی۔ اب مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود زیادہ اچھا نہ لگتا۔ میری خواہش ہوتی کہ میں ان سب سے الگ تھلگ رہوں۔ مجھے ہر وقت یہی ڈر رہتا کہ کوئی بچہ میرے اس نقص کی طرف اشارہ نہ کر دے۔ مجھے یہ نہ جتادے کہ میں صرف ایک آنکھ رکھتی ہوں۔ میرا اتنا خوبصورت چہرہ ایک آنکھ کے مصنوعی ہونے کی وجہ سے خوبصورت نہیں کہلا سکتا۔ عورت کے اندر اپنی خوبصورتی کو خود پرکھنے کا، اوروں سے اس کی تعریف سننے کا شوق شروع ہی سے ہوتا ہے اور میرا یہ شوق مجروح ہوگیا تھا۔

اور پھر لڑکی تو ''پرایا دھن'' ہوتی ہے۔ میری ممی کی سرد آہیں مجھے اور بے چین کر دیتیں ــــــ ''ہے بھگوان! یہ تیری کیسی لیلا ہے۔! تو نے میری بچی کو گورا رنگ دیا، تیکھے نقش دیئے، لمبے گھنے بال دیئے، دو موٹی موٹی بادام سی آنکھیں دیں، اور پھر ایک آنکھ چھین لی۔ اس کے لیے اچھا لڑکا مل سکے گا ہمیں؟''

میرے بال گوندھتے وقت، مجھے کپڑے پہناتے وقت وہ میرے چہرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔

''کیا بات ہے ممی؟''

''کچھ نہیں ــــــ کچھ نہیں بیٹی ــــــ '' وہ آنسو پی جاتیں۔ اور میں اداس سی، حیران سی، سہمی ہوئی ہی ان کی طرف دیکھنے لگتی۔ ان سے کچھ نہ کہہ سکتی۔

بچپن میں جس بچے سے مجھے سب سے زیادہ ڈر لگتا تھا۔ جو میرا سب سے زیادہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ تھا منوج! منوج جو میرے ڈیڈی کے دوست کا لڑکا تھا، میرا پڑوسی تھا اور ہر وقت ہمارے ہی گھر رہتا تھا۔ جب میں ایک برس کی تھی تو وہ تین برس کا تھا۔ ممی کہتی ہے وہ اپنے گھر سے ٹافیاں، بسکٹ لے آتا اور میرے منہ میں ٹھونس دیا کرتا۔ مجھے وہ اٹھانے کی، گود میں لینے کی کوشش کرتا اور اس کی یہ کوشش مجھے رُلا رُلا دیتی۔ میری آنکھ کے ضائع ہو جانے کے بعد اس کی اس کوشش کی ناکامی ہی نے جیسے اس کے دل میں میرا مذاق اڑانے کے انتقامی جذبہ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ وہ بات بات پر مجھے ''کانی'' کہتا۔ سب کے سامنے ''نقلی آنکھ والی'' کہتا۔ ''ہم کانی کو نہیں کھلائیں گے!'' کہہ کر میرا منہ چڑاتا۔ میں روہانسی ہو جاتی اور اسے رحم نہ آتا۔ مجھے وہ دن اب بھی یاد ہے جب اس نے میری موسی کے بچوں کے سامنے جو کچھ دن کے لیے ہمارے ہاں آئے تھے، مجھے ''کانی'' کہہ کر میرا مذاق اڑایا تھا۔ اور میں بہت روئی تھی۔ 'میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گی، کبھی نہیں کھیلوں گی'۔ میں نے اپنے تئیں فیصلہ کر لیا۔ اور میں اس سے کترانے لگی۔ اپنے کِھلونوں سے آپ ہی آپ کھیلتی رہی اور اسے یہ بھی ناگوار گزرا۔

''تم کیا سمجھتی ہو۔ میں تمہارے بغیر کھیل نہیں سکتا۔؟''

''تو جاؤ نا ــــــ کھیلو جا کر ــــــ''

''جاتا ہوں ــــــ کانی کہیں کی ــــــ زیادہ رعب نہ جتایا کر کمو ــــــ نہیں تو میں تیری دوسری آنکھ بھی پھوڑ دوں گا۔''

کہا تو اس نے بچپنے کی سی معصومیت کے ساتھ تھا لیکن میں کانپ گئی۔ اور اب میں کوئی بھی ایسی بات نہ کرتی جس سے اسے غصہ آجائے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی بے دلی سے اس کے ساتھ کھیلتی بھی رہتی۔ اور اسی طرح وقت گزرتا رہا۔

میری ممی میرے اس نقص کو اپنی نظروں سے یا میری نظروں سے تو نہیں چھپا سکتی تھیں لیکن انہوں نے دوسروں کی نظروں سے اسے چھپانے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے شروع ہی سے مجھے اعلیٰ تعلیم دینے کا مُصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اسکول کے بعد گھر پر دل لگا کر پڑھاتیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا یہ نقص میری زندگی کے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ اگر میری شادی نہ ہو تو میں خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکوں۔ دراصل انہیں یقین تھا کہ میری شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ڈیڈی کا خیال دوسرا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ دولت سے میری اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ ایک اچھا لڑکا دولت سے بھی تو خریدا جا سکتا ہے۔

ممی کی کوششوں سے اتنا ضرور ہو گیا کہ میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اول رہی۔ اپنے نقص کے احساس نے مجھے تنہائی پسند بے شک بنا دیا تھا، لیکن وہ میری ذہانت پر پردہ نہ ڈال سکا۔ ہاں البتہ میرے اندر ایک جذبہ ضرور نشو و نما پاتا رہا۔ نفرت کا جذبہ! ان لڑکوں کے خلاف نفرت جو ظاہری خوبصورتی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور مجھے اپنے گرد سب ایسے ہی لڑکے نظر آتے تھے! اور میں سوچنے لگتی۔ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔ میری شادی کی زندگی خوشگوار کیسے رہ سکتی ہے۔ دولت میرے اس نقص پر وقتی طور پر ہی تو پردہ ڈال سکتی ہے۔ بعد میں میرا یہ نقص پھر میرے جیون ساتھی کی نظروں کے سامنے آ جائے گا۔ اس وقت اسے چھپانے کے لیے میں دولت کہاں سے لاؤں گی____؟ ڈیڈی سے____؟ نہیں نہیں میں شادی کروں گی ہی نہیں۔

منوج سے بھی اب میری ملاقات رسمی طور پر ہوتی تھی۔ محض ایک پڑوسی کی طرح۔ ہمارے درمیان باتیں ہوتیں تو یہی سکول کی، پڑھائی کی، امتحانات کی باتیں____ تکلف میں لپٹی ہوئی اور بس! میری سنجیدگی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ بچپن کا شیطان طبیعت منوج بھی اب خاموش طبع

ہو گیا تھا ـــــــ سکول کے بعد کالج میں میں نے میڈیکل گروپ لیا۔ اس وقت وہ دوسرے سال آرٹس میں تھا۔ بعد میں میں میڈیکل میں داخل ہو گئی اور اس نے ایم ۔ایم نفسیات میں داخلہ لے لیا۔ ڈیڈی نے ایک دن خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی طرح منوج کے والدین کو تیار کر لیں تو میری شادی اس سے کر دیں۔ لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا۔ شادی اور پھر منوج سے ـــــــ ؟؟ بچپن کی وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگیں اور میں کانپ گئی۔ نہیں نہیں، کبھی نہیں ـــــــ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔ لیکن مجھے پتہ چلا کہ ڈیڈی نے میرے منع کرنے کے باوجود منوج کے والدین کو اشاروں ہی اشاروں میں جتایا تھا کہ وہ میری شادی میں ایک بہت بڑی دولت جہیز میں دیں گے۔ اور اس کے والدین نے اشارہ سمجھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے ڈیڈی پر تو غصہ آیا ہی لیکن ان کی خاموشی سے میرے نسوانی وقار کو بھی ٹھیس پہنچی۔ کیا عورت کی کوئی بھی خوبی اس کی خوبصورتی کے داغ نہیں چھپا سکتی۔ عورت کا چہرہ ہی سب کچھ ہے۔ میں نے منوج سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ ڈیڈی اور ممی نے بھی اس کے والدین سے قطع تعلق کر لیا۔

میں ڈاکٹری کے امتحان میں پاس ہو گئی۔ اس وقت منوج اپنے کالج میں نفسیات کا پروفیسر تھا۔ اس کی ذہانت کے چرچے مجھ تک بھی پہنچتے تھے۔ اور ایک دن سنا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری وظیفہ لے کر انگلینڈ جا رہا ہے۔ وہ انگلینڈ چلا گیا اور میں اپنے ہسپتال کے کام میں مصروف ہو گئی۔ ڈیڈی اب بھی مجھے شادی کے لیے مجبور کیا کرتے اور میرے انکار پر ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے۔ مجھے معلوم تھا کہ جو دو تین لڑکے انہوں نے میرے لیے دیکھے تھے وہ محض ان کی دولت کی وجہ سے یا میری ڈاکٹری کی تعلیم کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کے لیے رضا مند تھے۔ میں ان کی نظروں میں سونے کا انڈا دینے

والی مرغی تھی اور کچھ نہیں مجھے ڈیڈی کے احساسات سے بے پرواہونا پڑا۔ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔!

ایک روز ڈیڈی نے ممی کو بہت خوش ہوتے ہوئے ایک خبر سنائی۔

''کموکی ماں ـــــ سنا تم نے؟ منوج کو انگلینڈ میں کار کا حادثہ پیش آیا ہے اور اس کی ایک آنکھ جاتی رہی ہے۔ ابھی ابھی تار آیا ہے اس کا۔ اس کے گھر پر تو بھیڑ لگی ہے۔''

''اچھا۔ !اوہو!'' ممی بھی بہت خوش تھیں۔ لیکن مجھے ان کی خوشی بہت عجیب سی لگی۔ یہ کیسی خوشی تھی؟ وہ اس لیے خوش تھے کہ ان کی اپنی بیٹی کی بھی ایک آنکھ تھی۔! اس لیے خوش تھے کہ ان لوگوں نے ان کی ایک آنکھ والی بیٹی کو ٹھکرا دیا تھا۔ یا اس لیے کہ منوج کی ترقی ان سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ آخر وہ کس لیے خوش تھے؟؟ ایک دکھی آدمی کسی کو دکھی دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ ایک سکھی آدمی کسی کو سکھی دیکھ کر بھلے ہی جلنے لگے! ممی اور ڈیڈی ان کے ہاں افسوس کا اظہار کرنے کے لیے گئے ہیں۔ دکھ میں تو دشمن کی بھی خیر و عافیت پوچھ لی جاتی ہے۔ شاید اسی جذبہ سے!

منوج کی آنکھ کے حادثے نے اس کے والدین کا غرور ختم کر ڈالا تھا۔ اس کی ماں اب اکثر ہمارے ہاں آتی۔

''کمودنی کی ماں ـــــ منوج کا خط آیا ہے۔ اس نے مصنوعی آنکھ لگوائی ہے۔''

اور مجھے منوج کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ ساکن، بے جان سی نظر آنے لگتی۔

''ارے کمودنی کی ماں۔ ولایت میں تو ایسی عمدہ مصنوعی آنکھ بنتی ہے کہ کوئی دیکھے تو حیران رہ جائے۔ منوج نے لکھا ہے کہ اس نے سب سے لائق ڈاکٹر سے آنکھ بنوائی ہے۔ ہاں؟''

اور میں سوچنے لگتی۔ انگلینڈ میں تو پلاسٹک کی آنکھ بننے لگی ہے۔ پلاسٹک پر آنسوؤں کی فلورین کچھ اثر نہیں کرتی۔ شیشے کی آنکھ کی طرح وہ جلد ہی بے رونق نہیں

ہو جاتی۔ کیوں نہ میں بھی انگلینڈ جا کر ایسی ہی آنکھ بنوالاؤں۔؟

''کمودنی کی ماں۔ اب تمہیں کمودنی کی شادی کر دینی چاہئے۔ اب اس فرض سے بھی سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتیں؟''

او—— تو یہ بات تھی جس کی وجہ سے ممی اور ڈیڈی خوش ہوتے تھے۔ شاید اسی بات کے انتظار میں تھے۔!

''کیا کروں منوج کی ماں، کمودنی نے تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے!''

میں اندر بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ ممی کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ کس خوبصورتی سے انہوں نے بات کو فی الحال ٹال دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد لگیں مجھ سے اصرار کرنے۔

''بیٹا! تو اب ہاں کر دے۔ ہاں کر دے بیٹا۔ منوج جیسا لڑکا تمہیں ملے گا نہیں۔ اور پھر اب تو منوج بھی......'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ شاید انہیں اپنی یہ دلیل بہت کھوکھلی سی لگی تھی۔ لیکن ان کی اس دلیل نے میرے سوچنے کا انداز بدل دیا۔ اس وقت تو میں نے ممی کو ڈانٹ دیا، لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی۔ اب جب کہ منوج کی بھی ایک آنکھ جاتی رہی ہے، وہ میرے برابر ہی تو ہے۔ کسی قسم کا احساس برتری اب اس میں نہیں ہوگا۔ اس سے شادی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اب انہیں جہیز کا لالچ بھی کیا ہو سکتا ہے؟ اور میں نے ''اچھا ممی جیسے تمہاری مرضی!'' کہہ کر ممی اور ڈیڈی کی اداسی کو خوشیوں میں بدل دیا۔

دو ماہ ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔ لیکن پہلے ہی دن میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ یہ شادی محض ایک سودا ہے۔ دو مجبوریوں کا دو محرومیوں کا آپس میں سودا! ایک مصنوعی آنکھ کا دوسری مصنوعی آنکھ سے رشتہ۔ انہوں نے اس وجہ سے میرے ساتھ شادی

کے لیے رضا مندی دی تھی نا کہ ان کی اپنی آنکھ بھی جاتی رہی تھی! انہیں میرے سوا کوئی اچھی لڑکی مل نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے اس لیے میرے ساتھ شادی نہیں کی کہ میں انہیں اچھی لگتی تھی۔ ایک عورت کے لیے یہ کتنی خوشی کی بات ہوتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسی کیلئے اس سے شادی کی ہے لیکن میری قسمت میں یہ خوشی نہیں تھی۔ میری قسمت میں تو ایک اداسی تھی، ایک بوجھ تھا۔ ویسے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کالا چشمہ پہنے ان کا چہرا مجھے بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اور انہوں نے بھی بارہا میرے چہرے کی تعریف کی ہے۔

''تم کیا جانو کمو۔ تمہارے گورے چہرے پر یہ کالا چشمہ مجھے کتنا پیارا لگتا ہے۔''

لیکن ان کی اپنی آنکھ کے جاتے رہنے سے پہلے بھی تو میرے چہرے پر کالا چشمہ تھا۔ یہ کالا چشمہ تو مدت سے میرے چہرے کا حصہ ہے۔ لیکن اس وقت انہیں اس کے پیچھے میری مصنوعی آنکھ بھی نظر آ جاتی تھی۔ مصنوعی آنکھ، جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں۔ اور اب۔ اب انہیں وہ نظر نہیں آتی۔؟ یہ محبت نہیں، محبت کا آرٹ ہے۔ اور یہ آرٹ وہ خوب جانتے ہیں۔ ان کے پیار بھرے جملے بھی میرے من پر سے اداسی دور نہ کر سکتے۔ میری خوشیاں دب دب جاتیں۔

میں نے بتایا نا کہ یہ کالا چشمہ ہم دونوں کی زندگی کی ایک اہم جز ہے۔ اسے ہر وقت پہنے رہنا میری عادت ہے اور ان کی بھی۔ ہاں البتہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سے صرف سونے کے چھ سات گھنٹے نکال کر باقی ہر وقت اسے پہنے رہتے ہیں۔ سونے لگتے ہیں تو اتار کر سرہانے کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔ جیسے یہ کالا چشمہ ہی نہ ہو پاور گلاسز بھی ہوں۔ کہ جن کے استعمال سے ان کی دوسری آنکھ کی روشنی بھی تیز ہو جاتی ہو۔؟

آج جب وہ نہانے کے لیے غسل خانے میں گئے تو حسب معمول اپنا کالا چشمہ پہنے ہوئے تھے۔ غسل خانے کے ساتھ کا کمرہ ہمارا ڈریسنگ روم ہے میں اس وقت وہاں

کھڑی ڈریسنگ ٹیبل کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ وہ نہا کر باہر نکلے تو اچانک دہلیز میں لگے کسی کیل سے ان کا چپل الجھ گیا اور وہ بری طرح گرے۔ میں ان کی طرف دوڑی۔

''کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔؟'' ان کو سنبھالتے ہوئے میں نے پوچھا۔

ان کا چشمہ گر کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ اور وہ گھبرائے سے ہوئے زمین پر سے اس کے ٹکڑے بٹور رہے تھے۔

''چوٹ تو نہیں آئی ____؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''ہیں ____؟ نہیں نہیں ____ بالکل نہیں ____!'' انہوں نے میری طرف دیکھا اور میرا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا ____ ان کی تو دونوں آنکھیں ٹھیک تھیں ____!

تار ٹوٹنے تک

اس کے اسپتال سے آنے کے بعد، اس گلی کے باشندوں میں سب سے پہلے جو اس کی عیادت کو آیا وہ موتی تھا۔ اس کے پڑوسی کا کُتا! موتی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دُم ہلانے لگا۔ اور جب وہ اس کی چارپائی کے نزدیک آیا تو اس نے دیکھا موتی کا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ اس کے اپنے پیٹ کی طرح۔ اور وہ حیران رہ گئی ـــــــ وہ اپنی بیماری کو بھول کر موتی کے پیٹ کو دیکھنے لگی۔

''یہ کیا ہوا تجھے موتی ـــــــ؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر موتی کو سہلایا اس ایک پل میں وہ اپنا درد بھول گئی۔

آج پورے ایک ماہ بعد اس نے موتی کو دیکھا تھا ـــــــ اسپتال میں اپنی بیماری، دواؤں، ڈاکٹروں، نرسوں اور عیادت کے لیے آنے والے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان وہ موتی کے بارے میں بالکل نہیں سوچ سکی تھی۔ جب موتی کے مالک اس کی عیادت کے لیے آئے تھے تو اس نے ان سے موتی کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس وقت انہوں نے بتایا تھا کہ موتی بیمار ہے ـــــــ تو کیا یہ انہیں دنوں بیمار پڑ گیا۔؟!

اسے کینسر تھا ـــــــ اور اب تیسری منزل میں تھا ـــــــ گھر والوں نے اسے اس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی مہلک

بیماری ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی بیماری اب آخری منزل میں ہے۔

اب کی بار وہ پورا ایک ماہ اسپتال میں رہی تھی اور اب ڈاکٹروں نے اس کے شوہر کو بتا دیا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ گھر لے جایئے۔ زندگی کے آخری چند روز وہ گھر میں گزار لے۔ اور جو وہ گھر آئی تو حیران تھی ــــــ لوگ صحت یاب ہونے کے بعد اسپتال سے چھٹی پاتے ہیں اور وہ بغیر صحت یاب ہوئے اپنے گھر آ گئی تھی۔!

''گھر میں آرام رہے گا ــــــ ہے نا؟'' گھر پہنچنے کے بعد اسے سہارا دے کر اس کی چارپائی تک لاتے ہوئے اس کے شوہر نے اس سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے بے چارگی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اف! وہ کتنا تھک گئی تھی۔!

اس نے دیکھا تھا کہ اس کا شوہر اس سے نظریں ملانے میں گھبراتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کی نگاہیں کہیں چغلی نہ کھا جائیں۔

وہ شوہر سے پوچھنا چاہتی تھی ــــــ آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔؟ آپ میں اتنی ہمت کیوں نہیں ہے؟ آپ یہی سمجھتے ہیں نا کہ میں مرنے سے پہلے نہ مرجاؤں؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا ــــــ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ موت کو خوشی خوشی گلے لگالوں ــــــ جتنی زندگی ہماری قسمت میں لکھی ہے وہی تو جینے کو ملے گی ــــــ جتنی مدت کے لیے ہم دونوں کا ساتھ ہے اتنا ہی ساتھ تو رہے گا ــــــ زندگی نے جو کچھ بھی ہمیں دیا ہے ہم اس کے لیے زندگی کے شکر گزار ہیں۔

لیکن جب وہ اپنے شوہر کے اداس چہرے کی طرف دیکھتی تو خود بھی اداس ہو جاتی ــــــ اس کا علاج اب زیادہ تر ان دواؤں پر موقوف تھا جو اس کے درد کو کم کرنے کے لیے دی جاتی تھیں۔ جیسے ہی دوا کا اثر کم ہوتا وہ کراہ اٹھتی۔ اور اس کا شوہر اسے پھر دوا دے دیتا اکثر ایسا بھی ہوا کہ اسے ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہوتا اور موتی آ جاتا ــــــ اور وہ اپنا

درد بھول کر موتی کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھنے لگتی۔ موتی کے مالک کے لڑکے راجو نے اسے بتایا تھا۔

''آنٹی! موتی کو ایسائٹس (Ascites) ہوگیا ہے۔اس کے پیٹ میں پانی بھر جاتا ہے۔چار پانچ بار نکلوا چکے ہیں۔ پہلے ہر ہفتہ نکلواتے تھے۔اب ہر دوسرے تیسرے دن نکلوانا پڑتا ہے۔''

اور ایک دن جب راجو آیا تو موتی بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا گرتا پڑتا۔ جھولتا ہوا سا_____ پھولے ہوئے پیٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں_____ راجو اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور موتی پاس کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سر کو ایک طرف جھکا کر عجیب سوالیہ انداز میں۔

راجو بولا_____ ''آنٹی! ڈاکٹر کہتا ہے موتی کا علاج کرنا بالکل بے کار ہے۔یہ بچے گا نہیں_____ اسے مروا دینا ٹھیک رہے گا۔''

اور وہ روہانسا ہوگیا۔ یہ سن کر وہ بھی اداس ہوگئی_____ اس کی اپنی بیماری کے بارے میں ڈاکٹر سب جانتے ہیں۔انہوں نے اس کے شوہر کو بھی بتا دیا ہے۔شوہر نے اگرچہ اسے نہیں بتایا لیکن وہ جان گئی ہے_____ شوہر کو معلوم ہے کہ وہ بچے گی نہیں۔ پھر بھی اس کا علاج کروا رہا ہے_____ اور وہ بھی برابر دوا لے رہی ہے۔جب تک سانس تب تک آس_____ لیکن موتی؟_____ وہ تو جانور ہے_____ اس نے موتی کی طرف دیکھا۔موتی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہہ رہا ہو۔

''ہاں_____ اب میں دو ہی چار دن کا مہمان ہوں۔''

موتی آنکھوں سے باتیں کرتا تھا۔اپنی مہلک بیماری کے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا۔اپنا دکھ۔اپنی بے بسی۔

اس نے دیکھا۔موتی کا پیٹ کچھ زیادہ پھولا ہوا ہے۔لاشعوری طور پر اس کے

ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف چلے گئے ــــــ اس نے اندازہ لگایا ــــــ اس کا پیٹ بھی کافی اوپر تک پھول آیا تھا ــــــ وہ لیٹے لیٹے اپنے پیٹ کو نہیں دیکھ سکتی تھی ــــــ لیکن ہاتھوں سے پیٹ کی سُوجن محسوس کر لیا کرتی۔ اس کے پیٹ کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر تو باقاعدہ فیتے سے اس کے پیٹ کی سُوجن ناپا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور نگاہیں موتی کے پیٹ کی طرف۔

کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے موتی کی بیماری اور اس کی اپنی بیماری ایک سی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ اور بھی موتی کے نزدیک آ گئی تھی۔

موتی آتا تو وہ اس سے کہتی۔

''ارے موتی! اب تو نہ آیا کر۔ دیکھ! تجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جاتا ــــــ تیری تو اب ٹانگیں بھی ٹیڑھی ہو گئی ہیں ــــــ نہ آیا کر اب۔''

لیکن موتی کی آنکھیں جواب دیتیں ــــــ ''جب تک چل سکوں گا ــــــ آؤں گا ضرور ــــــ اور جب ٹانگوں پر کھڑا ہی نہ ہو پاؤں گا تو بات دوسری ہے۔''

وہ خود بھی تو اب بہ مشکل ہی بیڈ پر سے اٹھ پاتی ہے ــــــ ابھی چار ماہ پہلے وہ کتنی چاق و چوبند اور تندرست تھی! اچانک ایک دن اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا ہے ٹمپریچر لیا گیا تو بخار تھا ــــــ اور پھر یہ بخار اس کی زندگی کا حصہ بن گیا ــــــ اسے ہر وقت بخار رہنے لگا ــــــ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اور بخار ــــــ

پیٹ میں درد تو اسے پچھلے سال بھی ہوا تھا ــــــ اور ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا تھا ــــــ اور وہ دونوں فکر مند ہو گئے تھے ــــــ ان کے کوئی بچہ نہ تھا۔ آپریشن کے بعد تو بچے کی امید بھی جاتی رہے گی ــــــ اور وہ ایسے ڈاکٹروں کا علاج کرانے لگے جو بغیر آپریشن کے شفا کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور اس کا مرض بڑھ گیا ــــــ اسے علاج کے لیے ممبئی بھی جانا پڑا ــــــ ایک بار نہیں تین بار ــــــ اور وہ جان گئی کہ اسے کوئی مہلک

بیماری ہے، جو اس سے چھپائی جا رہی ہے ــــــ گھر کے کسی فرد نے اسے نہیں بتایا۔ نہ شوہر نے ــــــ نہ اس کے ماں باپ نے ــــــ لیکن ان کے چہروں پر لکھی تحریر سے اس نے اپنی بیماری کے بارے میں سب جان لیا جس طرح شوہر اسے جھوٹی تسلی دیتا ــــــ اسی طرح وہ بھی اسے کھوکھلا دلاسہ دیتی۔

''ارے آپ اداس ہو گئے؟ میں ٹھیک ہو جاؤں گی ــــــ بالکل ٹھیک۔''

''ہاں ــــــ یقیناً تم ٹھیک ہو جاؤ گی ــــــ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے شوہر کے ہونٹوں پر رینگ جاتی۔ اور اسے دکھ ہوتا۔ وہ آپس میں اس کی بیماری کے بارے میں کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔؟

جب اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا مرض لا علاج ہے تو وہ اکیلے میں کتنا روئی تھا۔'' نہیں نہیں ــــــ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھگوان ایسا نہیں کر سکتے ــــــ'' لیکن بھگوان کو شاید یہی منظور تھا۔

اور اب ــــــ اب تو اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے ــــــ اس آخری گھڑی کے لیے ــــــ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بھی ہمت سے کام لے ــــــ لیکن اس کا شوہر تو اسے بیماری کا نام بھی نہیں بتا رہا تھا۔

موتی اب تقریباً روز ہی آ جاتا ــــــ کبھی پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ، جب اس کے پیٹ میں پانی بھر جاتا اور کبھی پچکے ہوئے پیٹ کے ساتھ، جب اس کے پیٹ میں سے پانی نکال دیا جاتا۔

اور ایک دن راجو آیا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ــــــ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ روتا رہا ہے۔

''کیوں راجو؟ کیا بات ہے۔؟''

''پاپا موتی کو لے گئے ہیں ــــــ مروانے کے لیے ــــــ ساتھ میں ہمارا نوکر

شنکر بھی گیا ہے ایک بوری لے کر ___ موتی کو انجکشن لگے گا ___ اور جب وہ مرجائے گا تو بوری میں بند کرکے اسے دریا میں ڈال آئیں گے۔''

اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''دیکھو بیٹا! تمہیں صبر تو کرنا ہی پڑے گا ___ تم تو جانتے ہو موتی بہت تکلیف میں تھا۔''

''ہاں!'' راجو نے آہستہ سے سر ہلا دیا ___ اور پھر اچانک بولا۔

''آنٹی! تم بھی تو بہت تکلیف میں ہو۔''

___ اور وہ سُن ہو کے رہ گئی ___ راجو نے کتنی سچی بات کہی تھی ___ لیکن ___ لیکن موتی تو ایک جانور ہے ___ وہ اپنی موت پر اپنے سے تعلق رکھنے والوں کی حالت زار کے بارے میں نہیں سوچ سکتا ___ وہ یہ سب باتیں راجو کو کیسے سمجھائے؟!

اس کا شوہر اسے دوا دینے لگا تو اس نے شوہر کو بتایا ___ ''پڑوسیوں کے کتے کو موت کا انجکشن دے دیا گیا ہے۔''

اس کا شوہر بھی یہ سن کر اداس ہو گیا ___ اسی وقت وہ بولی۔

''یہ مرسی کلنگ (Mercy Killing) ہوئی نا ___ ؟ یہ مرسی کلنگ ہے نا؟'' یعنی جس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو، جو بہت تکلیف میں ہو اسے ڈاکٹر کی رائے سے، اس کی اپنی رضامندی حاصل ہو جانے کے بعد ابدی نیند کا انجکشن دے دینا۔''

اور وہ شوہر کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

اور اس کے شوہر نے نگاہیں جھکا لیں۔

اور اس وقت اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''دیکھیے میں سب جان گئی ہوں ___ اب آپ جھوٹ نہ بولیے گا۔ مجھے کینسر

ہے نا ___؟''

جواب میں اس کے شوہر نے اپنی نگاہیں اس کی طرف کر دیں۔ کرب ___ بے چینی ___ درد ___ سب ایک ساتھ ان نگاہوں میں سمٹ آیا ___ اور پھر ان آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا ___ درد کی ایک لہر سی اس ہاتھ سے اس ہاتھ اور پھر اس ہاتھ سے اس ہاتھ تک سرایت کر گئی۔

''لیکن بھگوان پر تو بھروسہ رکھنا ہی پڑے گا ___ آگے جو بھی قسمت میں لکھا ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہنا چاہ رہی تھی ___ دو ہی باتیں تو ممکن ہو سکتی ہیں ___ مرسی کلِنگ ___ یا پھر صبر اور تحمل سے اس بیماری کو جھیلنا ___ جتنے دن بھی زندگی باقی ہے ___ ہم دونوں کا ساتھ باقی ہے ___ ہنسی خوشی گزار دیتا۔''

''ہاں۔''

اور جب دوسرے دن ڈاکٹر آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پیٹ کی سوجن اگرچہ کچھ بھی کم نہ ہوئی تھی۔ وہ ہشاش بشاش اور پر سکون تھی۔ اور جب اس نے شوہر کو پکارا۔

'دیکھئے! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔'' تو جواب میں اس کے شوہر کی آواز ''آ رہا ہوں ___ '' میں بھی ایک صبر اور شکر نمایاں تھا۔

خدمت گار

تقریباً پانچ سو میٹر کی پہاڑی چڑھائی چڑھنے کے بعد جب ہم لوگ اس ڈاک بنگلے تک پہنچے تو شام رات میں بدل چکی تھی اور اس پہاڑی ڈھلوان پر ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر بنے جو پندرہ بیس گھر تھے ان میں سے روشنی چھن چھن کر آنے لگی تھی۔ پہاڑی قلی نے پیٹھ پر سے ہمارا سامان اتارا اور ڈاک بنگلے کے گیٹ کے پاس رکھ دیا اور خود چوکیدار کو بلانے چلا گیا۔

میں اور میرا ساتھی جیالوجسٹ مصرا پچھلے دو دن سے نیچے اتر کاشی میں دریا کے کنارے بنے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اب تین چار دن کے لیے اس پہاڑی پر ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں آئے تھے۔ مجھے اس جگہ کی بنیادی مٹی کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت کا پتہ لگانا تھا اور جیالوجسٹ مصرا کو اس علاقے کی ٹاپوگرافی کا مطالعہ کرنا تھا۔

اس اونچائی پر سے نیچے اتر کاشی کی روشنیاں ایک دلفریب نظارا پیش کر رہی تھیں۔ اوپر آسمان پر دمکتے چمکتے ستارے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ستاروں کے اور نزدیک پہنچ گئے ہوں۔ ہوا بھی کچھ اور صاف ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاک بنگلے کے دائیں طرف چار دیواری سے سٹے ہوئے ایک گھر میں سے اچانک روشنی نظر آنے لگی۔ وہ چوکیدار کا گھر تھا۔ اور اس نے قلی کے پہنچنے پر

روشنی کی تھی۔ اور وہ ہاتھ میں لالٹین پکڑے قلی کے ساتھ ہماری طرف آ رہا تھا۔

''چوکیدار! تمہیں ہمارے یہاں آنے کی خبر تو مل گئی ہوگی؟

''جی شاب جی۔ آج صبح جونیئر انجینئر شاب آئے تھے۔''

اور اس نے گیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اور پھر کمرے کا۔ اور اندر داخل ہوتے ہی میز پر رکھا مٹی کے تیل کا ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اور اس کی بتی ذرا اونچی کر دی۔ آزادی سے پہلے کا اس ٹیلے پر بنا یہ ڈاک بنگلہ صرف ایک کمرے کے سیٹ پر مشتمل تھا۔ اتنا پرانا ہونے کے باوجود بہت اچھی حالت میں تھا۔ اور چوکیدار نے اسے صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ چوکیدار سے پتہ چلا کہ سال میں ایک دو بار ہی کوئی آ کر ٹھہرتا تھا یہاں۔ اور وہ بھی زیادہ تر دن بھر کے لیے۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کا ایک اہم کام وہاں ٹھہرنے والوں کے لیے کھانا بنانا ہوا کرتا ہے۔ اور اس کے لیے برتن، کراکری سب سامان ڈاک بنگلے میں رکھا رہتا ہے۔ میں نے چوکیدار کو سو سو روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''کل صبح اتر کاشی سے ضروری سامان خرید لانا۔ کھانا بنانے کے لیے۔ ایک دال بنے گی اور ایک سبزی اور تھوڑے سے چاول بھی بنا لینا۔ ٹھیک ہے؟''

''جی شاب جی۔''

چوکیدار نوٹ ہاتھ میں پکڑے جانے لگا تو میں نے کہا۔

''سنو۔ صبح بیڈ ٹی مل سکے گی؟ میرا مطلب ہے چائے؟''

''جی شاب جی۔''

''تو ذرا کڑک'' چائے بنانا۔ دودھ صرف ایک چمچہ۔'' مصرا نے کہا۔

''جی شاب جی۔'' اور چوکیدار چلا گیا۔

رات کافی گہری نیند آئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ مصرا ابھی کمبل

اوڑھے لیٹا تھا۔ میں گیٹ سے باہر آکر ڈاک بنگلے کے آس پاس پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر ٹہلنے لگا۔ دو چار جگہ ڈھلوان پر سیڑھیوں کی طرح اوپر نیچے بنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں پہاڑی عورتیں کام کر رہی تھیں۔ رنگین کھردرے اونی کپڑے پہنے۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ چوکیدار گھر سے باہر اپنے چار پانچ ماہ کے بچے کو اٹھائے کھڑا تھا۔ گورے رنگ کا گول مٹول تندرست بچہ میری طرف لپکتا ہوا۔ بچے نے شاید ابھی ابھی دودھ پیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دودھ لگا تھا۔ چوکیدار مجھے سلام کرنے کے بعد بولا۔

''چائے بنالاؤں شاب جی؟''

''ہاں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد۔''

میں ڈاک بنگلے میں داخل ہوا تو مصرا ابھی اپنے بیڈ پر کمبل میں گھسا جیالوجی کا کوئی جرنل دیکھ رہا تھا۔

''کہاں کہاں گھوم آئے نگم صاحب؟ صبح گھومنے کی تمہاری یہ عادت بہت اچھی ہے یار۔ دورے پر آتے ہو تو بھی صبح گھومنے ضرور جاتے ہو۔ اپنے سے تو یہ ہوتا نہیں۔ اور پھر ہمارا تو کام کے سلسلے میں بہت گھومنا ہو جاتا ہے۔ سروے کے لیے آس پاس کا سب علاقہ پیدل چل کر ہی تو دیکھنا ہے مجھے۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ تمہارا کام پیدل چلنے کا بہت ہے۔''

''وہ بیڈٹی کا کیا ہوا؟ جو تم نے چوکیدار کو صبح بنالانے کے لیے کہا تھا؟''

''ابھی لا رہا ہے۔''

مصرا کے ساتھ میں نے کئی پہاڑی علاقوں کا دورہ کیا ہے۔ وہ چائے کو ''سنجیونی بوٹی'' کہا کرتا ہے۔ یعنی مردے میں جان ڈالنے والی بوٹی۔ صبح جب تک بیڈٹی نہیں پی لے گا۔ بستر نہیں چھوڑے گا۔ میں خود چائے کا ایسا عادی نہیں ہوں۔

لیکن دورے پر مصرا کا ساتھ ضرور دیتا ہوں۔ بلکہ اس کا خیال رکھتے ہوئے چائے کا انتظام میں ہی کرتا ہوں۔ بیڈ ٹی کا انتظار میں میں بھی اپنی بیڈ پر کمبل اوڑھے نیم دراز ہوگیا۔

چند منٹ کے بعد چوکیدار چائے لے آیا۔ایک چھوٹی سی ٹرے میں دو کپ باقاعدہ پلیٹوں میں رکھے ساتھ میں چینی اور چمچے۔ ہم دونوں کے بیڈ کے بیچ میں میز پر ٹرے رکھ کر چلا گیا تو ہم اپنے اپنے بیڈ پر ٹیک لگائے چائے پینے لگے۔ مصرا کو کڑک چائے اچھی لگتی ہے ۔ایسی چائے جس میں دودھ برائے نام ہو۔ دورے پر میں بھی ایسی چائے پی لیتا ہوں۔ چوکیدار مصرا کی پسند کی چائے بنا لایا تھا۔ چائے گرم تھی لیکن چائے کا مزہ کچھ عجیب سا تھا۔ نہ بہت خوشگوار اور نہ ہی ناگوار! کل ملا کر چائے اچھی لگی۔ اور جب چوکیدار کپ اٹھانے کے لیے آیا تو مصرا نے کہہ ہی دیا۔

''چوکیدار! چائے اچھی بنی تھی۔''

''جی شاب جی۔'' اس نے سر ہلا کر شکریے کا اظہار کیا۔

پروگرام کے مطابق جونیئر انجینئر نے تجویز کردہ دو جگہوں پر پانچ پانچ گڈھے کھدوا رکھے تھے جن میں سے مجھے نمونے اکٹھے کرنے تھے۔ دس بجے کے قریب جونیئر انجینئر دو مزدوروں کے ساتھ آ گیا۔ اور ہم لوگ سائٹ (Site) کے لیے روانہ ہوگئے۔ میں گڈھوں کو کچھ اور کھدوا کر نمونے اکٹھا کرواتا رہا اور جیالوجسٹ مصرا اپنے جیالوجیکل سروے کے سلسلے میں آس پاس کی چٹانوں کی جانچ کرتا رہا۔ دو بجے تک کام کر کے ہم لوگ ڈاک بنگلے میں واپس آ گئے۔ چوکیدار نے لنچ بہت اچھا تیار کیا تھا۔ لنچ اور پھر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ برآمدے میں آ کر بیٹھے ہی تھے کی چوکیدار چائے لے کر آ گیا۔ پہلا گھونٹ بھرتے ہی میں نے چوکیدار کی طرف دیکھ کر چائے کو سراہنے کے انداز میں ہلکا سا سر ہلا دیا۔ چائے صبح کی جیسی تھی۔ بلکہ صبح والی چائے سے

کچھ زیادہ اچھی لگی۔ ہوسکتا ہے کہ صبح ایک ہی بار پینے سے ہم اس کے انوکھے مزے سے مانوس ہوگئے تھے!

''کہو چوکیدار۔ تم اس محکمے میں کب سے ہو؟''

''بارہ شال ہوگئے شاب جی۔''

''بارہ سال؟ تو اب تمہاری نوکری پکی ہوگئی ہوگی؟''

نہ شاب جی۔ ہماری نوکری ابھی تک کچی ہے۔ ابھی تک ہم ''ورک چارج'' میں ہیں۔''

''ارے اتنے برس ہوگئے اور ابھی تم ورک چارج میں ہو؟''

جی شاب جی۔ پوشٹ تو دو خالی پڑی ہیں۔ دو شال سے خالی پڑی ہیں۔ پر بڑے شاب انہیں بھرتے نہیں۔''

اوہو!'' میں خاموش چائے پینے لگا۔ ایگزیکٹیو انجینئر سے میری تھوڑی جان پہچان ہے۔ آدمی بھلا ہے۔ پھر اس چوکیدار بے چارے کے ساتھ کیوں زیادتی کر رہا ہے؟ کسی سفارش والے کو رکھنا چاہتا ہوگا! اب تو معمولی چپراسی کی نوکری کے لیے منتری لوگ سفارش کرنے لگتے ہیں۔ یہ سیدھا سادا پہاڑی آدمی یہ بات کہاں سمجھے گا۔

چوکیدار کے جانے کے بعد میں نے مصرا سے کہا۔

''یار۔ تم تو اس ایگزیکٹیو انجینئر کو اچھی طرح جانتے ہو۔ ہے نا؟''

''ہاں نگم صاحب! اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کام کے سلسلے میں کئی بار میرا اور اس کا ساتھ رہا ہے۔''

''تو تم اس سے بات کرنا۔ اس بیچارے کی ملازمت پکی ہوجائے۔''

''ٹھیک ہے۔ کرلیں گے بات''

ہم لوگ چار دن وہاں رہے۔ صبح دس ساڑھے دس بجے نکلتے اور دو ڈھائی بجے تک ڈاک بنگلے میں واپس آ جاتے۔ میں ان چار دنوں میں باقاعدہ صبح ایک گھنٹے کے لیے گھومنے جاتا رہا۔ اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کی سب پگڈنڈیاں گھوم چکا تھا۔ بلکہ اب سب گھروں کے آس پاس سے گذر چکا تھا۔ زیادہ تر ان میں رہنے والی عورتیں ہی صبح ملتیں۔ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کام کرتی ہوئی۔ کبھی پیٹھ پر رکھے تکونے ٹوکروں میں طرح طرح کے جنگلی پھولوں کے گچھے یا صرف پتے ڈالے۔ نیچے اتر کاشی کی طرف جاتی ہوئی۔ کبھی ایک دو مرد بھی مل جاتے۔ اپنی کمر کے گرد رسّی لپیٹے۔ یہ مرد اتر کاشی میں قلی گیری کا کام کرتے تھے۔ اور وہ رسّی ان کے پیٹھ پر سامان لادنے کے کام آتی تھی۔ چوکیدار دونوں وقت کا کھانا خوب دل لگا کر تیار کرتا۔ ڈائننگ ٹیبل پر صاف ستھری کراکری سجا دیتا۔ پلیٹیں، ڈونگے، چمچے، گلاس، پانی کا مگ اور پھر سبزی، دال، چاول، چپاتیاں، سب گرم۔ کھانا کھانے کا مزہ آ جاتا۔ صبح کی بیڈ ٹی اور شام کی چائے تو بڑی باقاعدگی سے بنا دیتا۔ اس کی چائے کا تو ہم لوگ اب انتظار کرنے لگے تھے!

چوکیدار کی خدمت گزاری سے متاثر ہو کر ہم دونوں نے ہی سوچ رکھا تھا کہ ایگزیکٹیو انجینئر سے اس کی پکی نوکری کے بارے میں ضرور بات کریں گے۔ بارہ برس تک اسے اس طرح عارضی طور پر رکھنا کہاں تک جائز تھا؟ جب کہ دو ملازمتیں خالی پڑی تھیں۔ ڈاک بنگلہ چھوڑنے سے پہلے لاگ بک بھرنے اور ڈاک بنگلے کے حساب میں چوکیدار کو پیسے دینے کے بعد میں نے پچاس روپئے کا ایک نوٹ اسے انعام میں دے دیا جو اس نے خوشی خوشی لے لیا۔

''شاب جی یہ آپ کے پیشے بچ گئے تھے۔''

اس نے بائیس روپے میری طرف بڑھا دیئے۔

''اسے بھی رکھ لو۔ اور جاؤ قلی کو بلا لاؤ۔''

اور تھوڑی دیر کے بعد ایک قلی ہمارا سامان لے کر نیچے اتر کاشی کی طرف جا رہا تھا۔ خیال تو آیا کہ چوکیدار سے کہہ دوں۔ ''ہم تمہاری ملازمت پکی کروانے کے لیے تمہارے بڑے صاحب سے بات کریں گے۔'' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں عین وقت پر مصرا کترا جائے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کے پاؤں چھونے کے بعد جب اس نے ہاتھ جوڑ کر ''نمشتے شاب جی'' کہا تو اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ جیسے وہ اپنی اس کچی ملازمت میں خوش ہو۔ اور ہم سے کسی بھی قسم کی سفارش کی کوئی امید نہ رکھتا ہو اور نہ ہی ضرورت سمجھتا ہو! چلنے سے پہلے میں نے اس کی پھر تعریف کر دی۔

''تم نے کھانا بہت بڑھیا بنا کر کھلایا اور خاص طور پر چائے''

اور پھر اچانک مجھے یاد آ گیا مغربی جیالوجسٹ ایمرہسٹ کی ڈائری کا ایک واقعہ جو اسے ایک جیالوجیکل سروے کے دوران کسی پہاڑی گاؤں میں وہاں کے کسی باشندے کے گھر میں مہمان رہتے وقت پیش آیا تھا اور جو میں نے گزشتہ شب پڑھا تھا۔ اور میں نے چوکیدار سے پوچھ لیا۔

''سنو چوکیدار! یہاں کسی کے پاس گائے تو کیا بکری بھی نہیں ہے۔ تم چائے کے لیے دودھ کہاں سے لاتے تھے؟''

چوکیدار نے نہایت سادہ لوحی سے جواب دیا۔

دودھ شاب جی ......؟ شاب جی۔ آپ کی چائے کے لیے بہت تھوڑا سا دودھ چاہیے تھا۔ پرتازہ دودھ چاہئے تھا شاب جی ...... دو چمچہ صبح۔ دو چمچہ شام تازہ دودھ ہم گھر سے ہی بنا لیتے تھے۔''

''گھر سے؟ ـــــ کیا مطلب ہے؟''

''ہماری گھر والی کا اپنا دودھ شاب جی۔ ہمارا بچہ ابھی پانچ ماہ کا ہی تو ہے''
اس نے بلا کسی جھجھک کے جواب دیا۔
''ارے!'' میری نگاہوں کے سامنے چوکیدار کا بچہ آ گیا۔ ہمکتا ہوا۔ ہماری طرف لپکتا ہوا۔ دودھ لگے ہونٹوں کے ساتھ۔ اور پھر مجھے نظر آیا کپ۔ کپ میں چائے اور چائے میں تیرتی ہوئی دودھ کا ہلکا سا دائرہ بناتی ہوئی لکیر!
چوکیدار سلام کر کے وہیں کھڑا تھا۔ اور ہم قلی کے پیچھے ڈھلوان پر سے نیچے اتر رہے تھے۔
جب ہم نیچے اتر رہے تھے تو ہم دونوں ہی کو متلی ہو رہی تھی!
''اب زیادہ سوچ نہ یار۔ جو کچھ کھایا پیا وہ تو کب کا ہضم ہو چکا۔''
میں نے بیکار میں اس سے پوچھ لیا۔ نہ پوچھتا تو اچھا تھا نا؟''
مجھے پھر متلی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا۔ مصرا دو قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ اور ابکائیاں لے رہا تھا!